

مكتبة

الكتاب

تعارف

علامه ابوالخير اسدي

مجلس نشر السنه مخدوم رشيد ملتان



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

۵ اِس اوہیں کئی عرش کئی فرش پڑیں گے !
حالانکہ یہ منزل ہے رگ جان سے بھی دیک

م الکتاب میں اکلہ ہر تبار کا

جس کے پڑھنے کے بعد

شرک اور دہریت کی دیواریں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں !

علامہ ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنۃ - مخدوم رشید (مقام)



اِدارۃ اِسلامیۃ

0301-7444110

مَخْدُوم رَشِید-مُلْتَان

Azhar.asdi@gmail.com

Idarahislamia.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	مقدمۃ الكتاب	۴
۲	قرآن میں توحید کے سادہ اور علمی انداز کا طریقہ	۹
۳	حق کی وضاحت کے بعد اہل حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا	۱۱
۴	الحمد للہ رب العالمین میں معرفت الہیہ کی تشریح	۱۳
۵	قرآن میں توحید اور شرک کا مفہوم	۲۳
۶	عقائد کی حقیقت اور اہمیت	۵۳
۷	دورِ جدید میں قرآنی دعوت	۵۶
۸	قرآن میں ساری کائنات کو توحید کی دعوت دینے کا فطری اسلوب	۶۴
۹	خدا کی ہستی کے آفاقی دلائل	۸۰
۱۰	توحید کا شرعی تصور	۸۸
۱۱	توحید کے قرآنی بُرائین	۹۶
۱۲	معرفت الہیہ کے قرآنی دلائل	۱۰۶
۱۳	توحید باری تعالیٰ	۱۱۰
۱۴	قوانینِ فطرت میں تغیر کا امکان	۱۱۸
۱۵	اصولِ تعلیل کی موت	۱۳۷
۱۶	وجود باری تعالیٰ اور عقلیات	۱۴۶
۱۷	قوانینِ فطرت اور خدا کی مجبوری	۱۵۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۸	پرویزی مسک میں خُدا کا تصوّر -----	۱۶۶
۱۹	قوانین فطرت اور معجزات -----	۱۷۰
۲۰	سائنس کے جدید تصوّرات میں دہریت کا خاتمہ -----	۱۷۵
۲۱	خُدا کی عظمت اور سائنس کا عجز -----	۱۸۱
۲۲	رب العالمین کی تشریح -----	۱۸۳
۲۳	ساری کائنات کو کس نے تھام رکھا ہے -----	۱۹۰
۲۴	تخلیق انسان کی نفسی دلیل -----	۱۹۳
۲۵	نظام کائنات میں رزق کا انتظام -----	۱۹۶
۲۶	نظام کائنات میں شہد کی مکھی کس طرح کام کرتی ہے -----	۱۹۹
۲۷	اللہ سے اتنی دُوری کیوں ؟ -----	۲۰۵
۲۸	خُدا کا بگڑا ہوا تصوّر ! -----	۲۱۰
۲۹	مادّہ کے قدیم ہونے کا ردّ اور خُدا کا ثبوت -----	۲۱۳
۳۰	تضاد کے قانون سے آخرت کا ثبات -----	۲۱۵
۳۱	ڈارون کا نظریہ ارتقاء دہریت کا بنیادی سبب ہے -----	۲۱۹
۳۲	مادّہ و دہریت پر خُدا کی عظمت کا غلبہ -----	۲۲۴
۳۳	وحدت وجود کے نظریے میں توحید کی تعبیر -----	۲۲۴
۳۴	عالم اسباب (سلسلہ علّت و معلول) -----	۲۲۶

کتابت: محمد اقبال پوسٹل ملتان
رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
۱۹۹۵ء

عَرَفِ اَوَّل

تمام رسولوں کی تعلیمات کا خلاصہ تین چیزیں ہیں —

۱۔ معرفتِ الہیہ۔ یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے انسان کی تخلیق کی گئی ہے —

۲۔ رسالت — یہ معرفتِ الہیہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت رسولوں کی تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی —

۳۔ آخرت — یہ ہر عمل کے انجام کا دن ہے تاکہ اُس دن معلوم ہو سکے کہ معرفت کے حصول میں کون سے انسان کامیاب ہوئے اور وہ کون انسان ہیں جنہوں نے رسولؐ کی تعلیم کے بعد اس معرفتِ الہیہ کا صریحاً انکار کر دیا تھا تاکہ ان دونوں فریقوں کو اپنے اپنے عمل کا پورا حصلہ دیا جاسکے —

ان تینوں چیزوں کو

سُورَةُ الْاِنْتِجَامِ میں اجمال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ باقی سارے قرآن میں ان تینوں چیزوں کی تفصیل کے ساتھ تشریح کی گئی ہے —

۱۔ الحمد للہ رب العالمین میں معرفتِ الہیہ کا بیان ہے —

۲۔ انعمت علیہم میں اُن مُنعم علیہم رسولوں کا ذکر ہے جن کے ذریعے انسانوں کو معرفتِ الہی

کی تعلیم دی گئی ہے اور ان میں اُن لوگوں کا بھی ذکر ہے جن پر اطاعت کی وجہ سے
انعام ہوتا رہا ہے —

۳ — مالکِ یومِ الدین میں آخرت کا اثبات ہے جس میں معرفتِ الہیہ میں
کامیاب انسانوں اور ناکام سرکشوں کے انجام کا امتیاز کیا جائے گا —
چونکہ یہ تینوں باتیں ایہامانیات کا جزوِ عظم ہیں جب تک ان
پر پورے یقین کے ساتھ ایمان نہ لایا جائے کوئی انسان بھی حقیقی مسلمان نہیں ہو سکتا
اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اُمّ الکتاب کی تفسیر میں معرفتِ الہیہ
کی تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے تاکہ —

مُحَدِّثین، مُشْرِکین اور مُتَشَکِّکین

کی طرف سے اب تک اللہ کی معرفت اور اس کے وجود پر جتنے شبہات وارد کئے
گئے ہیں ان کے ہر ارتیابی نظریے کی اچھی طرح تردید ہو جائے —
اللہ سے دُعا ہے کہ ہماری اس ادنیٰ کاوش کو معرفتِ الہیہ کے بھٹکے ہوئے
انسانوں کے لئے صحیح ہدایت کا ذریعہ بنادے — آمین ! —

۵ — یہ چینِ مسرور ہو گا مغربِ توحید سے

ظلمتیں سب دُور ہوں گی جلوہ نورِ شید سے

عاجز ابو الخیر اسدی

۷ دسمبر ۱۹۹۵ء

مَقَدِّمَةُ الْكِتَابِ

قرآن میں دو مقام پر (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۲۹) یہ حکم دیا گیا ہے کہ :-

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ —

”اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہو جائے۔“

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے، اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک جارح ہے، انہوں نے فرمایا کہ اُس وقت اسلام تھوڑا تھا، چنانچہ جب کوئی شخص دین توحید کو اختیار کرتا تو اہل شرک اُسے ستاتے، کسی کو وہ قتل کر دیتے، کسی کو زنجیروں میں باندھتے اور کسی کو عذاب دیتے، یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی اور یہ صورت حال باقی نہ رہی کہ عقیدہ توحید کی بناء پر کسی کو ستایا جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں فتنہ سے وہی چیز مراد ہے جس کو ایذا رسانی کہا جاتا ہے یعنی مختلف عقیدہ رکھنے کی بناء پر کسی کو ستانا قدیم زمانہ میں شرک کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ اہل شرک ہزاروں سال تک یہ کرتے رہے کہ وہ توحید کا عقیدہ رکھنے والوں کو ستاتے۔

(وَمَا لَكُمْ مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ) —

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم، کا شن یہ تھا جس کو آپ نے اپنی زندگی میں مکمل

فرمایا کہ آپ اس مخالفانہ صورت حال کو ختم کر دیں کہ وہ شرک کے عمومی غلبہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیں تاکہ خدا کے بندوں کے لئے توحید کا عقیدہ اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بن رہی ہے وہ رکاوٹ باقی نہ رہے —

موجودہ زمانہ میں شرک کی جارحانہ حیثیت ختم ہو چکی ہے مگر غور کیجئے تو اصل صورت حال دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔ آج دوبارہ انسان کے لئے دین توحید قیام کرنے کی راہیں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں — مگر آج دین سے روکنے والا عنصر اپنا کام فکری طاقت کے زور پر کر رہا ہے نہ کہ شمیری طاقت کے زور پر —

آج کا فتنہ جدید ملحدانہ افکار کا فتنہ ہے۔ جو کام قدیم زمانے میں شرک کرتا تھا وہ آج ملحدانہ افکار انجام دے رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں ایسے افکار غالب آ گئے ہیں جو خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیتے ہیں جو وحی والہام کو فرضی بتاتے ہیں، جو آخرت کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ افکار دین توحید کو اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔ آج کا فتنہ یہ ہے کہ خود سوچنے کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان یا تو منکر بن گیا ہے یا وہ کم از کم متشکک ہے —

یہ ایک قسم کا فکری حملہ ہے۔ ہم کو اس حملہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب ہمیں دوبارہ قائلویم حتیٰ لا تکن فتنۃ پر عمل کرنا ہے۔ مگر یہ عمل شمیر کے ذریعہ نہیں ہوگا بلکہ افکار کی طاقت کے ذریعہ ہوگا، ملحدانہ افکار کا جواب ہمیں توحید افکار سے دینا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ علمی استدلال سے جدید ملحدانہ افکار کو بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری ہے گی جب تک یہ نظریات اپنا غلبہ نہ کھودیں۔ اور توحید کا فکر وقت کا غالب فکر بن جائے —

غلبہ اور مغلوبیت کا یہ واقعہ اولاً فکری میدان میں ہوگا۔ یہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہوگا جیسا کہ ہم موجودہ زمانہ میں مغربی افکار کا دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم

نے روایتی علوم پر غلبہ پایا ہے، ہنشاہی نظریہ کے اوپر جمہوری نظریہ فائق ثابت ہوا ہے تخلیقی طرز فکر پر ارتقائی طرز فکر کو بالائری حاصل ہے۔ یہ سب کے سب فکری غلبہ کے واقعات ہیں۔ اسی نوعیت کا غلبہ ملحدانہ فکر پر موجدانہ فکر کے لئے مطلوب ہے، یہی غلبہ ملت کی اگلی تمام کامیابیوں کی تہید ہے —

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں ملحدانہ افکار کا غلبہ ان کی کسی جوہری اہمیت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام تر صرف مغالطہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو نئے سائنسی حقائق دریافت ہوئے وہ حقیقہ قدرت خداوندی کے بھیدوں کا اظہار تھے، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دین توحید کے حق میں فطرت کے دلیل تھے، مگر مسلمان مختلف اسباب میں جدید سائنسی علوم میں پیچھے ہو گئے۔ وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ ان علوم کو صحیح رخ دے سکیں۔ اور ان کو ان کی تائید میں استعمال کریں، ملحد علماء نے اس غلام سے فائدہ اٹھایا، انہوں نے جدید معلومات کو غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے حق میں استعمال کیا، جن واقعات دین توحید کا اثبات نکل رہا تھا، ان کو دین الحاد کی دلیل بنادیا۔ اس کی ایک واضح مثال ارتقاء کا نظریہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ملحدانہ فکر میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے —

زمینی طبقات کے مطالعہ کے دوران انسان کے علم میں یہ بات آئی کہ قدیم زمانہ کے حیوانات کے ڈھانچے مخصوص کیمیائی عمل کے نتیجہ میں پتھر کی صورت اختیار کر گئے ہیں زمین کی کھدائی سے اس قسم کے بہت سے متحجر نمونے جمع کئے گئے۔ ان پر ریڈیو ایکٹیو ڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کیا گیا تو تقریباً صحت کے ساتھ ان کی تاریخیں معلوم ہو گئیں۔ یہ تحقیقات سو سال سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری رہیں۔ یہاں تک انسان اس پوزیشن میں ہو گیا کہ مختلف انواع حیات کے درمیان تاریخ کے اعتبار سے ترتیب قائم کر سکے —

اس تاریخی ترتیب سے معلوم ہوا کہ وہ تمام مختلف انواع حیات جو آج زمین پر ظاہر
ہیں ایک وقت نظر آرہی ہیں وہ سب زمین پر ایک وقت موجود نہیں ہو گئیں بلکہ زمین پر
ان کے ظہور میں ایک تاریخی ترتیب ہے۔ وہ یہ کہ سادہ انواع حیات سب سے پہلے ظہور
میں آئیں۔ اس کے بعد تدریجاً انواع حیات ظہور میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر
انسان ظاہر ہو گیا۔ اس طرح واحد الخلیہ جاندار زمین پر پہلے وجود میں آئے۔ اور انسان
اس حیاتیاتی ترتیب کے سب سے آخر میں ظاہر ہوا۔

نظر یہ ارتقاء کی عمارت جن مشاہدات پر قائم کی گئی ہے ان میں سب سے اہم مشاہدہ
یہی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ زندگی کی مختلف
قسمیں ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئیں۔ یعنی زندگی کا ہر اگلا فارم اپنے پچھلے فارم سے نکلتا
رہا۔ یہ ترقی ہر اگلی نسل میں جمع ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ اس کے آخری مجموعہ نے وہ اعلیٰ صورت
اختیار کر لی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

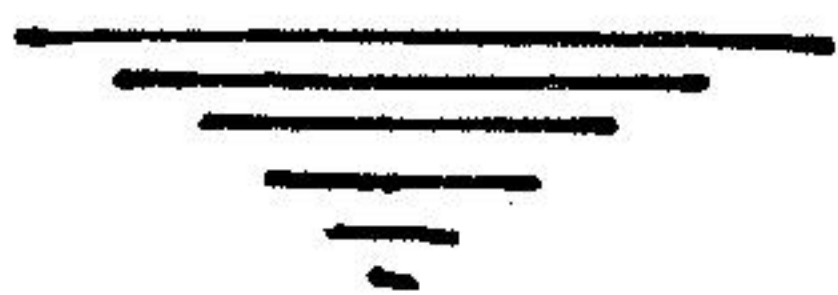
مگر یہ سراسر غلط تعبیر کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی حقیقی استدلال کا نتیجہ، خالص علمی نقطہ نظر
سے دیکھا جائے تو جو بات مشاہدہ میں آتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر انواع حیات
کی موجودگی میں ایک زمانی ترتیب پائی جاتی ہے نہ یہ کہ انواع حیات ایک دوسرے کے
لبطن سے بطریق تناسل پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔

اصل مشاہدہ صرف تخلیق کی زمانی ترتیب کو بتا رہا تھا مگر غلط تعبیر کے ذریعہ
اس کو زندگی کے ارتقائی ظہور کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ ارتقاء کے مشاہدات خالق کی تردید
نہیں کرتے، جیسا کہ خود چارلس ڈارون نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں تسلیم کیا ہے
بلکہ اگر یہ مشاہدات درست ہیں تو وہ خالق کے تخلیقی عمل کی ترتیب کو بتاتے ہیں۔
یہ مختصر جائزہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ موجودہ زمانے میں اسلام کے احیاء کی
راہ کا پہلا بنیادی کام اسلام کا فکری غلبہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ فکری غلبہ بظاہر دشوار ہونے

کے باوجود انتہائی آسان ہے، اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی مثالیں اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے لوگ اسلام کے نہایت سخت دشمن کے رُوپ میں ظاہر ہوئے مگر صرف ربع صدی کی دعوتی جدوجہد نے بتایا کہ اس طاقتور دشمن کے اندر مددگار کی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اس طرح ساتویں صدی ہجری میں تباہی قبائل اسلام کے خلاف ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے۔ مگر ایک صدی سے بھی کم عرصے میں معلوم ہوا کہ یہ طاقت ورتلوار صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر وہ اسلام کی طاقتوں خادم اور محافظ بن جائے۔

یہی موجودہ زمانہ کے "اسلام دشمن" علوم کا معاملہ ہے۔ ان علوم نے بظاہر آج اسلام کو مغلوب کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کوششوں کو صحیح رخ سے جاری کر سکیں تو نصف صدی بھی نہیں گزرے گی کہ یہ سارا علم اسلام قبول کر لے گا، وہ اسلام کے علم کلام کی صورت اختیار کر لے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ جدید علمی قوت صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ وہ خدا کے دین کی طاقت ورومددگار بن جائے۔ اسلام کے حق میں اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ضروری شرط ہے کہ ہم دوسرے میدانوں میں اپنی جو قوت ضائع کر رہے ہیں، اس کو سمیٹ کر اسی ایک میدان فکری انقلاب لانے کے میدان میں لگا دیں، جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن اسلام کی ہی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ صحیح آغاز ہی دراصل صحیح اختتام کا دوسرا نام ہے۔



قرآن میں توحید کے

سادہ اور علمی انداز کا طریقہ

قرآن میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتے اس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں (وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ) — (المؤمنون ۱۱۷)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم نے کہا کہ موحّد کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، مُشرک کہتا ہے کہ خدا کئی ہیں، اسی طرح ایک خدا کا وجود دونوں کے درمیان متفق علیہ ہو گیا، کیونکہ مُشرک نے کہا کہ خدا کئی ہیں تو ایک خدا کو اس نے پہلے ہی مان لیا، اس طرح ایک خدا کا وجود تو اپنے آپ ثابت ہے۔ اب دلیل کی ذمہ داری موحّد پر نہیں بلکہ مُشرک پر ہے۔ ایک کے بعد وہ خود خداؤں کے وجود پر دلیل لائے۔ یہ سادہ استدلال کا ایک نمونہ ہے، ہر معاملہ میں استدلال کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ اور دوسرا علمی، کچھ لوگوں کے لئے سادہ دلیل کافی ہو جاتی ہے مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ زیادہ علمی انداز میں ان کے سامنے بات کو واضح کیا جائے، قرآن میں دونوں انداز کے دلائل موجود ہیں —

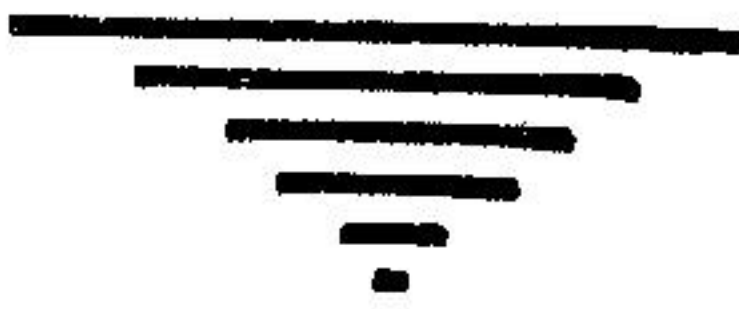
اوپر کی مثال بُرہان کی سادہ تفسیر ہے مگر اس بُرہان کی علمی اور سائنسی

تفسیر یہاں موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو تمام مائل شدہ شہادتیں خالق کی واحدانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ خالق کے تعدد کی طرف، مثلاً وسیع کائنات کے تمام اجزاء کا ترکیبی مادہ صرف ایک ہے۔

پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی کار فرمائی ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہیں مگر سب کی سب متوافق طور پر کام کرتی ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان سب کا ناظم ایک ہی ہے، —————

کائنات کا کوئی جزو اپنے عمل کے دوران جب کوئی مسئلہ پیدا کرتا ہے تو اس کا دوسرا جزو فوراً اس کی تلافی کیلئے آجاتا ہے۔ تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہیں مگر دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ دونوں بالکل کاگ وھیل کی طرح بل کر کام کرتے ہیں۔ اگر دونوں کے الگ الگ خدا ہوں تو دونوں میں اس طرح کامل ہم آہنگی نہیں ہو سکتی —————

(وحید الدین خان)



حَقِّ کی وضاحت کے بعد

اہل حق کو کوئی خسر نہیں پہنچ سکتا

بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا اور رسول کی مخالفت کی جب کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی وہ اللہ کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے اعمال کو ڈھا دے گا۔	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَمَشَاقِقِ الرُّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَضُرَّوْا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُجْطَاسِعُ مَا لَهُمْ (محمد ۳۲)
---	---

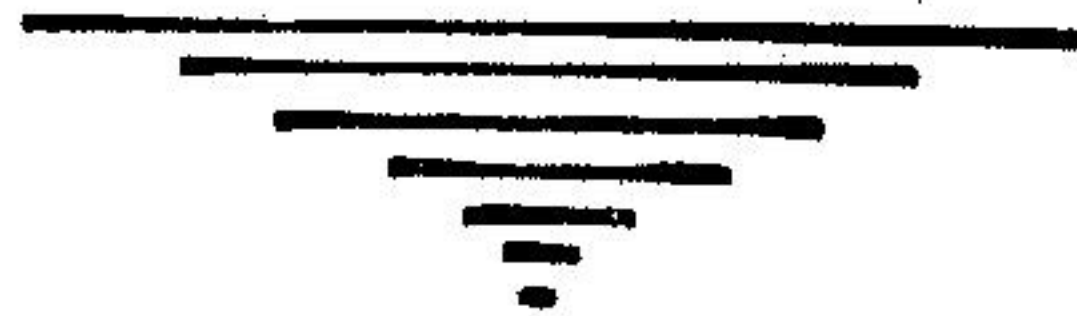
اس آیت میں اس نوعیت کی دوسری آیتوں میں اللہ کے ایک نہایت اہم قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ حق کا انکار کریں اور حق کے راستے میں کاوٹ ڈالیں اور حق کے داعیوں کے مخالف بن کر کھڑے ہوں، وہ حق کا اور حق کے علم برداروں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، ان کی تمام مخالفانہ کاروائیاں عین قانون خداوندی کے تحت ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گی۔

مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ مخالفین وہ ہوں جن پر ہدایت کی تہن کی گئی ہو جن کے اوپر امر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہو۔

اس شرط کا تعلق مخالفین سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خود حق کے داعیوں سے ہے۔
 حق کے داعیوں کی طرف سے اگر یہ شرط پوری کر دی گئی ہو تو یہ اس بات کی ضمانت ہے
 کہ دشمنانِ حق کی کوئی بھی سازش یا کوئی بھی مخالفانہ کارروائی اہل حق کے اوپر کارگر
 نہ ہو سکے گی۔ وہ اپنی تمام تدبیروں کے باوجود یقینی طور پر ناکام رہیں گے کہ حق کے داعیوں
 کو کوئی واقعی نقصان پہنچا سکیں۔

جب کچھ لوگ خالص حق کی دعوت لے کر اٹھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط
 کے ساتھ اس کی تکمیل تک پہنچائیں تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کے اندر جتنی
 سعید روہیں شامل ہوتی ہیں وہ سب اللہ کی توفیق سے حق کو قبول کر کے حق پرستوں کے
 گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے
 اور بول لوگ تبیین کے باوجود حق کے مُسکربنہ رہیں وہ اپنی دانستہ سرکشی کی بنا پر اس
 کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ انہیں پکڑے اور ان کو مغلوب کر کے اہل حق کو ان
 کے اوپر غلبہ عطا کر دے۔

(وحید الدین خان)



الحمد لله رب العالمین میں معرفت الہیہ کی تشریح

اس کا لفظی مفہوم یہ ہے: —

”ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو ساری

کائنات کا پروردگار ہے۔“ —

یہ جملہ قرآن کریم کا حرفِ اول ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کو اجمال کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ الحمد میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہر قسم کی تعریف صرف اللہ ہی کیلئے بکھولے پھر اس کے بعد ایاک نعبد و ایاک نستعین میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حمد یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی جائے اور اپنی ہر احتیاج کی تکمیل کے لئے اُسی ذات سے مدد طلب کی جائے۔ —

عبادت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جس ذات کی عبادت کی جا رہی ہے عابد کے علم اور یقین میں اُس ذات کا صحیح تعارف بھی موجود ہو۔ اس لئے رب العالمین کے جملے میں اللہ نے پہلے اپنا اجمالی تعارف کرادیا ہے۔ تاکہ ہر عابد جب بھی حمد کی صورت میں اللہ کی عبادت کرے، اس کے ذہن میں معبودِ حقیقی کا صحیح تصور پہلے موجود ہو ورنہ اس تصور میں جس قدر بھی نقص موجود ہو گا اس کی تمام عبادتیں بیکار ہو جائیں گی۔ —

رب العالمین میں اجمالی تعارف کی تلخیص یہ ہے: —

(۱) کہ عالمین اضافت کے لحاظ سے رب کا مضاف الیہ ہے۔

 جاتی ہے۔ جہاں مضاف الیہ اور مضاف میں حقیقی مغائرت پائی جاتی ہو۔
 ورنہ دو چیزوں میں اضافت ظاہر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اب اس کا مطلب یہ ہے کہ رب اپنی جن مخصوص صفات کے ساتھ مختص ہے
 عالمین سے مغائرت کی وجہ سے اس پر مخلوق کی کسی صفت میں بھی مماثلت نہیں ہو سکتی
 اسی طرح عالمین کی ہر ہر نوع جن صفات کی حامل ہے۔ رب سے مغائرت کی وجہ سے
 اس کی کسی نوع پر بھی الہی صفات کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ اس مغائرت نے
 خالق اور مخلوق کے درمیان ہر قسم کی مماثلت اور اتحاد کو ختم کر دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ
 ایک امام کا قول کا نقل کرتے ہیں کہ توحید یہ ہے : -----

قدیم ذات کی اس طرح تقرید اور
 تجرید بیان کی جائے کہ قدیم ذات
 اور کائنات میں حقیقی مغائرت
 ثابت ہو جائے -----

إِسْرَادُ الْقَدِيمِ
 عَنِ الْحَادِثِ

رب العالمین میں وحدت الوجود کے بنیادی عقیدے کی بھی اچھی طرح تردید
 موجود ہے کہ اضافت کی وجہ سے جب عالمین اور رب میں حقیقی مغائرت ثابت
 ہو رہی ہے۔ تو پھر ان دونوں کے درمیان عینیت اور وحدت کس طرح قائم ہو سکتی
 ہے۔ اسی طرح کوئی مخلوق اللہ کی کسی صفت کی مظہر کیسے بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ ظاہر اور مظہر کے وجود
 میں جب تک کسی قسم کی مشارکت نہ مانی جائے، کوئی وجود اپنی کسی صفت کو کسی مظہر
 میں بھی منعکس نہیں کر سکتا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جتنے اکابر گزرے ہیں
 وہ مخلوق کو مظہر الہی ثابت کرنے کے لئے یہ مثال دیتے ہیں کہ جس طرح آئینہ میں سورج
 کی شعاعیں منعکس ہوتی ہیں۔ اسی طرح صفات الہی بھی اپنے مقربین بندوں میں

نظاہر ہو جاتی ہیں، لیکن وہ حضرات اس مثال سے یہ بات بھول گئے کہ سورج اور آئینہ کی مثال میں شعاعوں کا انعکاس اس لئے صحیح ہے کہ وہ دونوں محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں مقررین کا وجود تو محسوسات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اللہ کی ذات غیر مرنی اور غیر محسوس ہے اس لئے اس کی کوئی صفت بھی محسوس مخلوق میں منعکس نہیں ہو سکتی۔ دیکھتے! اضافت کی اس منغارت نے دُنیا کے کتنے اتحادی وجودی اور شرکیہ نظریات کا ابطال کر دیا ہے۔

۲۔ رب العالمین میں معرفت کی ایک تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالمین کا رب ہے اور عالمین کا ذرہ ذرہ اس رب کا مربوط ہے۔ مربوط چیز وہ ہوتی ہے جو اپنے وجود کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے کی محتاج ہو۔ رب کا مفہوم یہ ہے، امام راغب فرماتے ہیں:۔

یعنی کسی چیز کو اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح تبدیل و نشو و نما دیتے رہنا کہ وہ چیز اپنی استعداد کے مطابق حد کمال کو پہنچ جائے۔

هُوَ اِلْتِذَاذُ الشَّيْءِ حَالًا
فَحَالًا اِلَى حَدِّ
الْقَدَرِ

مثلاً جب بچہ پیدا ہوتا ہے اگر اس کی پیدائش کے بعد اس دنیا میں اس کی نشو و نما کا انتظام نہ کیا جائے تو وہ اپنی طبعی عمر کو کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اپنے وجود کے بقاء کے لئے ہر وقت اللہ کی ربوبیت کی محتاج رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا اس کائنات کی ہر مخلوق اپنی تخلیق کے لحاظ سے اتنی ناقص اور محتاج ہے کہ جب تک رب کی ربوبیت اس کی بقاء کا انتظام نہ کرے کوئی چیز بھی اپنے وجود کو اس دنیا میں قائم نہیں رکھ سکتی۔ قرآن میں جہاں جہاں

رب کا اسم استعمال کیا گیا ہے آپ دیکھیں گے وہاں اُس کے ساتھ کسی نہ کسی مربوط کا ذکر بھی ضرور شامل ہو گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کائنات میں رب سے برتر سمجھتی ہے۔ قرآن کے اکثر مقامات میں آپ کو ربّک کی اضافت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جیسے واذکر اسم ربّک۔ سبح اسم ربّک۔ اس میں ربّک کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول جب تیری ہستی اپنی بقا کے لئے اس کی ربوبیت کی محتاج ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ بھی اپنے رب کی تسبیح اور تقدیس کرتے رہیں۔ دُعاؤں کی آیات میں اکثر رَبَّنَا کا لفظ آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب جب ہمارا وجود تیری ربوبیت کے سہارے قائم ہے تو ہمارے ان مصائب کو بھی تو ہی دُور کر سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر مخلوق جب اپنے وجود کی بقا کے لئے ہر وقت اُس کی ربوبیت کی محتاج نظر آتی ہے۔ تو وہ مخلوق جو خود محتاج اور عاجز ہے وہ دوسری مخلوق کی کس طرح سہارا بن سکتی ہے۔ مثلاً کہ جن انبیاء اور اولیاء کو اپنے مصائب میں سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ ایت چیلنج کر رہی ہے۔ جب تک آپ لوگ ان قدسی نفوس کو عالمین سے خارج نہ کریں گے وہ مربوط و عاجز ہونے کی وجہ سے کوئی مُصیبت بھی دُور نہیں کر سکتے۔

اس آیت میں رب العالمین کا مفہوم دیکھئے:

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ	پس ہر قسم کی ستائش صرف اللہ
وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ	کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمینوں
وَلَهُ الْکِبَرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا پروردگار

وہو العزیز الحکیم ہے۔

دیکھئے۔ اس آیت میں عالمین کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے پھر اس کے ساتھ آسمان

اور زمینوں کو بھی شامل کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے۔ اس کائنات کی ہر مخلوق عالمین کے ارجح میں شامل ہے۔ جو مجموعی طور پر اس کی ربوبیت کی ہر وقت محتاج ہے۔

۳ — عالمین کے لفظ میں معرفت الہی کی ایک اہم دلیل یہ ہے۔ عالمین لفظ عالم کی جمع ہے۔ عالم بروزن خاتم ہے۔ جو اسم آلہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے خاتم اُس انگوٹھی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اہم دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے پس اسی طرح عالم کا مفہوم وہ علامت ہے۔ مَا يُعْلَمُ بِهِ الشَّيْءُ جس کے ذریعے کسی چیز کو معلوم کیا جاسکے۔ پس یہاں ساری کائنات کو عالمین اس لئے کہا گیا ہے۔ اس میں جتنی بھی مخلوق ہے عالم یعنی علامت اور دلیل ہونے کی وجہ سے کسی ہستی کے موجود ہونے کی نشاندہی کر رہی ہے۔

قاعدہ یہ ہے جہاں کوئی چیز بطور علامت استعمال ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس علامت سے اس کا مدلول دریافت ہو سکے۔ جیسے تیز دھوپ کی علامت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورج آسمان پر پوری تمازت کے ساتھ موجود ہے اسی طرح کائنات کی ہر چیز جو اپنے اپنے مقام پر قائم ہے۔ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والی ہستی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ کوئی طویل چھت دیواروں اور ستونوں کے بغیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ لیکن آسمان کو دیکھئے کہ وہ کس طرح طویل اور بلند ہونے کے باوجود ستونوں کے بغیر ایک ہی سطح پر قائم ہے اس کا ستونوں کے بغیر قائم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو اپنی قدرت سے اتنی وسیع عمارت کو تھامے ہوئے ہے۔ ورنہ ایسی بلند اور وسیع چھت کسی سہارے کے بغیر کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ جب ایک لفظ میں چند حروف ایک ترتیب سے رکھے جاتے ہیں۔ تو وہ لفظ ایک مسمیٰ وجود کے مفہوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے شین، یا اور را کو بلانے سے شیر کا لفظ بن جاتا ہے جس سے

ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ اس سے ایک طاقت بجا نور مراد ہے۔ اسی طرح مخلوق کی ہر ہر چیز جو
 شکل میں کائنات کی وسیع سطح پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک صاحب بصیرت جب اس کا
 مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے الفاظ ڈھل ڈھل کر ایک ایسا مفہوم پیدا کرتے ہیں جس سے
 معرفت الہی خوب آشکارا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشرک قوم سورج
 اور چاند کے وجود کو اپنا رب سمجھے ہوئے تھے وہ صرف ان کی روشنی اور حدت سے
 متاثر تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ایک صحیح بصیرت کے حامل تھے، انہوں نے
 جب سورج کا مشاہدہ کیا کہ واقعی سورج اپنی حدت اور روشنی میں بڑا کمال رکھتا ہے
 لیکن غروب ہونے کے بعد جب اس کی روشنی اندھیرے میں تبدیل ہو گئی تو آپ نے
 فرمایا یہ کیسے رب ہو سکتا ہے جو اپنے وجود کو ایک جگہ تھام سکتا ہے اور نہ اس
 کی روشنی اندھیرے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم ایسے بھاگنے اور چھپنے والوں کو
 قطعاً پسند نہیں کرتے، دیکھئے وہ مشرک لوگ صرف سورج کی حدت اور روشنی
 کی وجہ سے اُسے اپنا رب بنائے ہوئے تھے، لیکن اس کا غروب ہونا جو اُس کی
 کمزور اور تغیر کی دلیل تھی وہ اُس دلیل کے مفہوم کو قطعاً نہ سمجھ سکے کیونکہ جو چیز اپنی کامل
 حالت کے بعد ناقص حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اس
 کے وجود پر کسی دوسری ہستی کا تغلب ہوتا ہے۔ جو اُس چیز کے کامل وجود کو ایک ناقص حالت
 میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی متغیر اور ناقص چیز الوہیت کے ساتھ متصف
 نہیں ہو سکتی اب آخر میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمیں جس حمد کے بیان
 کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس حمد کا طریقہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ الحمد للہ میں پہلے یہ دعویٰ
 کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر ستائش کا مستحق ہے، پھر اس دعویٰ کے مدلول پر
 یہ توسیل لائی گئی ہے۔ وہ ذات چونکہ ساری کائنات کی پروردگار ہے، اس لئے
 وہ ہی ہر ستائش اور حمد کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اب حمد کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم

رب العالمین میں مغائرت ثابت کر کے تمام کائنات کو اس کا محتاج اور مرلوب سمجھیں اور رب کو کائنات کے ذرے ذرے کا مربی اور پروردگار سمجھیں۔ اس عقیدے کے اظہار کو اللہ کی حمد کہتے ہیں۔ اور اس حمد کی عملی صورت کو **اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ————— اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور جب تو نے ساری کائنات کو اپنا مرلوب اور محتاج ثابت کر دیا ہے۔ ————— اس لئے کسی دوسرے سے نہیں بلکہ ہم اپنی ہر حاجت میں تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی حمد کرنے کا عملی طریقہ یہ ہے جیسے **اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** میں بیان کیا گیا ہے۔ حمد کے اس طریقہ قویم کا نام صراطِ مستقیم ہے جو لوگ اس طریقہ پر چلتے رہے ہیں۔ اُن کا ذکر **اَلْنُّعْمَتِ عَلَیْہِمْ** میں کیا گیا ہے۔ اب لازم تھا کہ اُن العام یافتہ نفوس کو اس کا بہترین صلہ بھی دیا جائے۔ اور جن لوگوں نے اس طریقہ قویم کو اپنے اختیار سے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ انہیں بھی اس نافرمانی کی پوری سزا دی جائے۔ —————

ہَآلِکَ یَوْمِ الدِّیْنِ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہم نے اِیَّاکَ دن مقرر کر دیا ہے جہاں پر ہر سعید اور شقی کو اپنے اپنے عمل کا پورا معاوضہ مل جائیگا۔ اسلام میں سب سے زیادہ جس عبادت میں عملی توحید کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نماز ہے۔ حدیث میں ہے نماز کی جو اصل رُوح ہے وہ سورہ فاتحہ ہے۔ اس کو ہر نماز میں اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کا جو بنیادی مفہوم ہے وہ ہر نمازی کے عقیدے میں ہر وقت مستحضر رہے اور یہ ایسا مفہوم ہے جس کے استحضار سے نمازی (واسجد واقرب) تقرب الہی کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ حدیث میں ہے جب انسان نماز کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ کفر کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جس عمل سے تقرب الہی حاصل ہو سکتا تھا، جب اُسے عمداً چھوڑ دے گا تو لازماً رفتہ رفتہ کفر کے کنارے تک پہنچ جائیگا۔

خلاصہ المقصود

- ۱۔ — الحمد للہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی عبادت اور حمد کا مستحق صرف اللہ ہے۔ رب العالمین میں اس دعویٰ کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ جو ذات کائنات کو معدوم سے موجود کر کے اس کی ہر مخلوق کی پرورش کر رہی ہے وہی ذات ہر قسم کی عبادت کے لائق ہو سکتی ہے۔ —
- ۲۔ — معرفت کی پہلی دلیل یہ ہے کہ رب اور عالمین کے تعلق کو اضافت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان اضافت چونکہ مغایرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے رب کو ایسے درجے میں رکھا جائے کہ اس کی کوئی صفت بھی مخلوق پر ثابت نہ ہو سکے اور عالمین میں جتنی مخلوق شامل ہے اُسے کسی ایسی صفت سے موصوف نہ کیا جائے جو رب کی کسی صفت کے ساتھ مماثلت رکھتی ہو عیسائی اپنے عقیدہ تغلیث میں حضرت عیسیٰ پر بھی الوہیت کی اسی صفت کا اطلاق کرتے ہیں جس الوہیت کے ساتھ اللہ کی ذات مختص ہے۔ اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رب العالمین میں حقیقی مغایرت کو ملحوظ نہیں رکھا، نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ جو عالمین کی مخلوق میں شامل تھے وہ رب کے درجے میں شامل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت سے گر کر حضرت عیسیٰ کے برابر ہو گئے جن حضرات کے نزدیک حقیقۃً محمدیہ کی وجہ سے ذات نبویہ پر رب کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ علامہ کاظمی لکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا مبنی، وحدۃ الوجود کا لفظ ہے۔ اور وحدۃ الوجود ایک ایسا نظریہ ہے جو مسلمانوں کے اکثر مسالک میں

مسلم ہے۔ اس لئے ایسے عقیدہ والوں کی تکفیر کرنا اُمتِ مسلمہ کی پوری اکثریت کی تکفیر ہو جاتی ہے۔ دیکھئے، اس عقیدہ کی بنیادی غلطی بھی یہی ہے۔ چونکہ وحدت الوجود کے نظریے میں کائنات اور خدا کے درمیان حقیقی عینیت اور وحدۂ ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ذاتِ نبویہ جو کائنات میں داخل تھی مناسبت کے ارتفاع سے ربوبیت کے درجہ میں داخل ہو گئی۔ منصور علاج نے بھی انا الحق اس لئے کہا تھا، اس کے نزدیک فنا کا یہ مفہوم تھا جہاں قدیم اور حادث کے درمیان مغایرت مرتفع ہو جاتی ہے ابن عربی اپنی کتاب فصیح الحکم میں لکھتا ہے کہ فرعون کا یہ قول کہ میں رب ہوں۔ اس کا یہ قول اس لئے صحیح تھا کہ اسے بھی ہمارے نظریے کے مطابق خدا کے ساتھ عینیت حاصل تھی دیکھئے الحمد للہ رب العالمین میں مخلوق اور خالق کے درمیان مغایرت کو ملحوظ رکھنے سے کس طرح یہ لوگ جادۂ قویم سے بھٹکتے رہے ہیں —

۳۔ معرفت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رب پر ربوبیت کا اطلاق ہوتا ہے اور اللہ کی ہر مخلوق مغایرت کی وجہ سے ربوبیت میں داخل ہو جاتی ہے ہر مرئوس چونکہ اپنی بقا کے لئے ہر وقت رب کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی دوسرے کی قطعاً مدد نہیں کر سکتا۔ ایک نستعین کا یہی مفہوم ہے کہ اے اللہ! ہم ہر مصیبت میں تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء سے اس لئے مدد طلب نہیں کرتے کہ وہ مرئوس ہونے کی وجہ سے خود ہی اپنے حوائج میں محتاج اور عاجز نظر آتے ہیں —

۴۔ معرفت کی تیسری دلیل یہ ہے، عالمین لفظ عالم کی جمع ہے۔ عالم اس علامت کو کہتے ہیں جس کے نشان سے کسی دوسری ہستی کی نشاندہی ہو سکے، اس لئے قرآن میں ہمیں حکم یا گیا ہے۔ کائنات کی ان چیزوں میں تدبیر کریں تاکہ تم ان کی تنظیم اور ترتیب کا مشاہدہ کر کے ذاتِ باری کے خالق اور فاطر ہونے کا اقرار کر سکو۔ —

سارے رسولوں نے توحید کی دعوت میں سب سے پہلے جس آفاقی دلیل کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ساری کائنات کا فاطر ہے اس لئے اس کی ذات میں کسی قسم کے رد و ادا

کے کی گنجائش نہیں ہو سکتی —

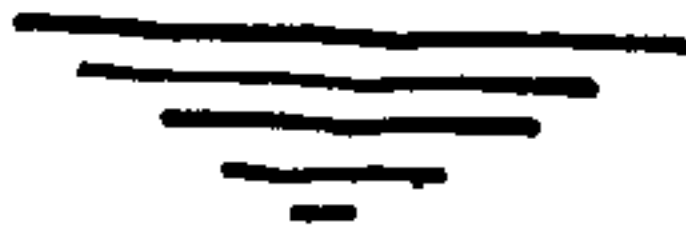
قالت لہو وسلم
افی اللہ شلک

فاطر السموت والارض
(القرآن)

ہر رسول اپنی اپنی قوم کو توحید نبھانے میں یہی
دلیل پیش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ سائی

کائنات کا فاطر ہے تو اتنی مضبوط دلیل کے
بعد اب اس کی ذات میں کس طرح تردد ہو سکتا ہے

معرفت الہیہ کے یہی بنیادی اصول ہیں جن پر انسان کی ابدی نجات موقوف ہے۔



قرآن میں

توحید اور شرک کا مفہوم —!

(سید سلیمان ندوی)

سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات اسلام پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا۔ مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کس درجہ پر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اہمیت اصلی محسوس کی — خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا —

یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا
اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے
معاف کر دے

إِنَّ لَا يَخْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ
وَيَخْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ
يَشَاءُ (نساء ۱۸)

عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سنیکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام

برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لئے سب پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا —

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی۔ شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب کے متاثر ہوتا ہے، اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و مہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُر زور تلاطم، غماص کی نیرنگ آرنیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر متفصل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور و غریب کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق پیدا کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے —

شرک کی جو گونا گوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال کیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے —

(۱) — دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی اعلانیہ شرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے ان مذہبوں کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور محکم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفت خلق اور احیاء و امانت پر ہمیشہ کے نام سے موسوم ہیں۔ مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعال خیر و شر کا ایک خالق نہیں

ہو سکتا، ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص بُرائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا —

اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی نگاہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر و شر ہو جاتی ہیں۔ آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور بُرا لیا جائے تو شر ہے۔ زہر نہ اچھا ہے نہ بُرا ہے۔ اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کر دے تو شر ہے —

اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔ نہ کوئی شے دُنیا کی خیر مطلق ہے نہ کوئی شر محض — اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے —

تجھ کو جو نیکی پہنچی، تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مُصِیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ
فَمِنْ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ
مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ
(نساء ۱۱)

حاصل یہ کہ اس دُنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہیں تو اچھی چیزوں کیلئے الگ اور بُری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خالق ایک ہی ہے دُونہیں ہیں —

اور خدا نے کہا کہ دُو خدا نہ بناؤ
وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو
اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں
اور زمین میں ہے —

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا آلِهَةً
إِثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ
فَإِيَّائِي فَامْرُؤُونَ وَلِلَّهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ —

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم روکنا (۲) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص

کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص

پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر کرشن وغیرہ کو اسی خوش اعتقاد نے آدمی سے خدا بنایا، اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی۔

اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ — (نساء) ۲۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود کہ وہ ایک عظیم مرتبت کے حامل تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی۔

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ (کہف ۱۱۲)

ایک خدا ہے۔

اس میں عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی۔ اس پر یہ آیت اتری۔

تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب کے گاہک وہ ظالم ہیں۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (آل عمران)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے
نہایت خواہشمند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی —

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ
اَٰحْبَبْتَ (قصص)

تم جس کو چاہتے ہو اس کو
ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کیلے دُعائے مغفرت کی اس پر
وہ اُن مجید میں آیا —

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
اِنَّ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ
مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ
(توبہ : ۱۰) —

تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ
چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ
بھی مغفرت چاہو گے تو خدا انکی
مغفرت نہ کرے گا —

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے
کہ لوگ آپ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے —
بار بار فرماتے تھے —

لا تطرونی کما
اطرى الیہود و
النصارى —

میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ
کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے
اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

(۳) شرک کا اصلی ضریعہ ہے کہ
خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق

درمیانی واسطوں کا مُشرکانه اعتقاد

جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا و درکار ہے، اس کا رُخ دُوسری
جانب بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات
اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مُرادیں ان ہی دیوتاؤں

اور معبودوں سے مانگتے ہیں، ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہِ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل نبیاء و صلحا، بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس بناء پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلبِ مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی

کہہ دیا: —

میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست	لَا سَتُغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا
ضروری کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے	أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ
سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔	مِنْ شَيْءٍ — (متحد ۱)

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم جن لوگوں کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانہ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے	قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ سَرَعْتُمْ
ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا	مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ
بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو	كَشَفَ الصُّرَّةَ عَنْكُمْ وَلَا تَحْزَنُوا
یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ بھی زیادہ	أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ
قرب حاصل کرنے کیلئے خود خدا ہی کی	يَبْتَغُونَ إِلَهًا سِوَاهُ الْوَسِيلَةِ
طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس	إِلَهُهُ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ
کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں	رَحْمَةً وَيَخَافُونَ عَذَابَ

اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔
 بیشک جسے رب کا عذاب ڈرنے
 کے قابل ہے —

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ
 مُحْدُوًّا — (بنی اسرائیل: ۲۰)

خوارقِ خدا کے حکم سے ہوتے ہیں (۴) بشرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ

عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن

اشخاص سے خوارقِ عادت سرزد ہوتے ہیں، ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خُدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خُدائی تک پہنچا دیتا ہے —

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائصِ نبوت میں سے ہے تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور محمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسبِ ذیل امور بیان کئے گئے ہیں —

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

اور کُفَّار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ)

پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں

نہیں اُترا، کہہ دو کہ خدا اس پر قادر

ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ

نہیں جانتے —

وَقَالُوا الْوَلَدُ نَزَّلَ عَلَيْهِ آيَاتُ

مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ إِلَهَ اللَّهِ قَادِرٌ

عَلَىٰ أَنْ يَنْزِلَ آيَةً وَلَٰكِن بَشَرٌ

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ —

(النجم: ۱۸)

(۲) باوجود اس کے کُفَّار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت

معجزہ پر موقوف نہیں —

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا الْوَلَا

اور کُفَّار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان

اَنْزَلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٍ مِّنْ رَّبِّهِ
اِنَّمَا اَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ
قَوْمٍ هَادٍ - (رعد: ۱)

نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے
چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس
کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو۔

(۶) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء یا پیشوا یا
مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ

حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ
آیت اتری —

اَتَّخَذُوا اَاجْبَاسًا هُمْ وَّرُءُوبًا
ذَہُورًا رَبِّیَّابَا - (توبہ، ۵)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں
کو رب بنالیا۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائیؓ کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوا ان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں
سمجھتے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں
حلال اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کیا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال
اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے
لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص
ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدا یا ان دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور
سلاطین و امراء کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت
سختی سے اس کو روکا —

صفات الہی کی توحید | (۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کے جائیں

جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بناء پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے، اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے کبھی فال سے، کبھی پالنے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے ان کو جنات غیب کا حال بتا جلاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیات نازل ہوئیں۔

وَعِنْدَ لَا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (العام: ۷)

اور خدا کے پاس غیب کی کُنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ:۔
مفاتح غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۔ حمل یعنی لڑکا ہو گا یا لڑکی

۲۔ کل کب ہو گا

۳۔ بارش کب ہو گی

۴۔ کس جگہ موت آئے گی

۵۔ قیامت کب آئے گی

اگرچہ علم غیب اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور غیب کی ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہشمند

ہوتے ہیں — یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گارہی تھیں، گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا —

وفینا رسول یحلوما | اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے

فی غدا | جو کل کی بات جانتا ہے —

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گارہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں —

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي | کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا
خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ | کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں
الْغَيْبِ - (العام: ۵) | اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے —

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ | کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب
الْغَيْبِ اِلَّا اللَّهُ (زل: ۵) | نہیں جانتا —

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی۔ بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا "اب نہ جایا کرو" عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا، یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو، بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہنوں نہیں انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا شیطان ایک آدھ بات

سُن لیتا ہے اور پُرغی کی طرح قُرُقُر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سوبلیش جھوٹ بٹا دیتا ہے —

جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عرف کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی اعراف کے پاس جائے گا اس کی چابیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں، آپ نے ان کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کا ہن کے پاس جا کر اسی باتوں کو سچ سمجھے وہ **حُمد** پر جو کچھ اُترا ہے اس سے انکار کرتا ہے —

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا — کہانت کی گرم بازاری سر ہو گئی۔ فال، شکون بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدا عانہ طریقے مِرٹ گئے، پرندے اور پانسلوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی —

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب مخفی قوتوں کا ابطال

خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا، اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا، اور دُعا و کلمات الہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے۔ اسی قسم کے فاسد

خیالات کے استیصال کیلئے ہر نماز میں اور ہر نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا
نَسْتَعِينُ ط

(اے عالم کے پروردگار ہم تیر ہی
آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد
چاہتے ہیں۔)

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ
أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ
وَلَقَدْ عَلِمُوا
لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي
الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ط
(البقرہ: ۱۰۲)

یہ جادو اور ٹوٹکے کر نیوالے کسی کو کچھ
نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے
حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور
ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان
رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً
ان کو علم ہے جو ان کو حاصل کرتا ہے
اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

يُحِيلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِ
هُوَ إِنَّهَا تَسْحَى ط

مصری جادو گروں کے جادو سے
یہ اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ
رہے ہیں۔

(طہ: ۳۱)

بلکہ بعض صحابہؓ نے ان مکار جادو گروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل کا حکم دے دیا
تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو، ان کے اس
عاجزہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

الحمد للہ جامع ترمذی باب ماجاء فی حد الساحر و الوداد و باب اخذ الجریہ من الجحش۔

ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: —

ان الرقی والتماثی | بے شک جھاڑ پھونک، گڈے
والترلة شرکۃ۔ | اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ

(البوداد و ابن ماجہ) | شرک ہیں —

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگہ پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا۔ وہ گھر آئے تو اس نے اٹھنے پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک گڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔ ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کام کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ یہ دُعا پڑھتیں: "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، اسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو۔"

اوہام و خرافات کا ابطال | (۱۰) وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک
اہل عرب لرزہ بہ اندام رہتے تھے اور جن کو
وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا طلسم توڑ
دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں، فرمایا: —

لا عدوی ولا حیرۃ ولا | نہ چھوت ہے نہ بدفالی ہے نہ
صفر ولا ہامۃ۔ | پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ
(البوداد و ابن ماجہ) | مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے

ایک اور صحابیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا : —
 المیافة والطيرة
 والطيرة والطير
 من الجبت —
 (الوداد ابن ماجہ)

پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے
 اڑنے سے فال لینا اور کنکری
 پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا
 شیطانی کام ہیں —

ایک اور صحابیؓ آپؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے، پھر ان صحابی
 نے کہا کہ ہم صحابہ ہیں کوئی نہیں جو اس کو بُرا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے یہ بھی آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بختر“ (نو) کچھ نہیں یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات
 کوئی دخل نہیں، اسی طرح غول بیانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپؐ
 نے ایک لفظ سے باطل فرمادیا۔ فرمایا —

لا غول (الوداد باب فی الطیر) غول بیابانی کچھ نہیں —
 بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے
 ابطال کیا اور سورۃ النعام میں ان کے مُشرکانه عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی۔
 اور سورۃ مائدہ میں فرمایا گیا —

مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ
 وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ
 وَلَا حَامٍ — (مائدہ : ۴)

خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ
 عام نہیں ٹھہرایا —

بحیرہ — اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بُتوں کی نذر کرتے تھے —
 سائبہ — اس جانور کو کہتے تھے جو بُتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا —
 وصیلہ — بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نہ ہو تو اس کو بُت پر چڑھائیں گے
 اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر نہ وہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ

زنجی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا —

۱۔ وہ اُونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چلتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا —

یہ اور امی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک منہجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، لیکن بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹوٹنے ٹوٹنے کو دافع مرض سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو تصریح اور تعبیر کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً: —

۱۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند اور سورج میں گہن لگتا ہے، آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو سورج گہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کی نشانی ہے کسی کے مرنے سے ان میں گہن نہیں لگتا۔

۲۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

۳۔ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک ستارہ ٹوٹا، آپ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے

عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مہم جاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو سب سے ٹوٹتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے سب سے نہیں ٹوٹتے —

۴ — شیر خوار بچوں کے سر ہانے اُسترا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ تلنے پائیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے —

۵ — نظر بد سے بچنے کے لئے اُونٹوں کے گلے میں قلاوہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اُونٹ کے گلے میں قلاوہ نہ رہنے پائے —

(الغرض توحیدِ کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا، اسلام کی اس اصلاحِ اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دُنیا کو دیوؤں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید | (۱۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت

کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار کے سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار میں سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت

کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے: —

هُؤلَاءِ شُفَعَاؤُنَا | یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی
عِنْدَ اللَّهِ (یونس : ۲) | ہیں —

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا: —

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا | ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ
إِلَى اللَّهِ نُلْفِيَ (زمر : ۱) | ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔
یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانہ
خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور بنی چونکہ خدا کے پیارے
اور محبوب ہیں اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے
اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب
اور برگزیدہ ہیں، وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ: —

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَ | ہم خدا کی اولاد اور اس کے
أَحِبَّاؤُهُ (مائده : ۳) | پیارے ہیں —
قرآن نے کہا: —

بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْنُ | بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے
خَلَقَ يَخْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ | ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے
وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ | جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے
سزا دے — (مائده : ۳)

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا —

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا
أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ
وہ ان نے کہا: —

وَعَرَّ هُوَ فِي دِينِهِ مَّا
كَانُوا يَفْتَرُونَ (آل عمران)
اور یہ اپنے دین سے بنا کر جھوٹ
عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب
کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو
موردہ اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ) کو قربانی دے کر ان کے
گناہوں کا کفارہ دے دیا، اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ اور ان کے
بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر
کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا۔ اسی لئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا
عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا
میں حق بلا — پیغام محمدی نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا —

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ
رُهْبَانَهُمْ أَسْرَابًا مِّنْ
دُونِ اللَّهِ — (توبہ) —
انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے
عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا
بننا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ —

وَمَنْ يَخْفِرْ الذُّنُوبَ
إِلَّا اللَّهُ — (آل عمران) —
اور خدا کے سوا کون گناہوں
کو معاف کر سکتا ہے۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل
و انصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے، قیامت

کے دن خدا حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا۔

عَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِ
وَاُخِي الْهَيْئِ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ (مائدہ : ۱۶)

اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا
تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری
مال کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بار الہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تُو نے کہا تھا۔ میں نے تو ان کو یہ
تعلیم نہیں دی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب
اَنْ تَعْبُدُوْهُمْ فَاَنْتُمْ عِبَادُكَ
وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (مائدہ : ۱۶)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بند
ہیں اور اگر تو بخش دے تو سب کچھ کر
سکتا ہے کہ تُو غالب اور حکمت والا ہے

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور
عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔
بُت پرستوں عرب کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ دیوتا اور ان کے بُت خدا کی طرف سے
دونوں عالم میں مختار کل ہیں وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے
ہیں، اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن کریم
کفارہ غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بُت پرستانہ طریقہ، شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح
تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے
سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ الشَّفَاعَةِ
اِلَّا مَنْ شَرِهَدَ بِالْحَقِّ وَ هُوَ
يَحْكُمُوْنَ (زخرف : ۶۶)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے
ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے
لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی
اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا
مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ
عَهْدًا — (مریم: ۶)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے
لیکن وہ جس نے رسم والے خدا سے
اِستِدار لے لیا —

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُونِ الرَّهَةِ
اِنْ يُرِدَنَّ الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَّا
تُغْنِي عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا
وَلَا يُنْقِذُون —
(یس: ۲)

کیا خدا برحق کو چھوڑ کر جھوٹے
معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمن
مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی
شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں
پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں

گفاز فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا۔
وَكُفُّوا عَنْ شَفَاعَتِهِمْ شَيْئًا
إِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ
لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَرْضٰی

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ
ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی
لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت
دے جس کے لئے چاہے اور پسند

(نجم: ۲)

اَمَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ
شُفَعَاءَ قُلْ اُولٰٓئِكَ كَانُوا
لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا
يَعْقِلُوْنَ (زمر: ۵)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی
شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگر یہ کچھ
اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں
تو بھی؟ شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہہ گا۔
وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَاءَ

اور تم دیکھتے نہیں، تمہارے ساتھ

تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے
کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے تھے شرکاء ہیں۔
اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین
ناامید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا شریک
بتاتے تھے ان میں کوئی ان کا شفیع

كُلُّ الَّذِيْنَ رَا عَمَلَهُمْ اَنَّهُمْ
فِيْكُمْ شُرَكَاءُ ۝۱ (النعام: ۱۱)
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ
الْمُجْرِمُوْنَ وَلَوْ كُنُّ لَهِمْ مِّنْ
شُرَكَاءٍ لَّهٗمْ شَفَعُوْۤا۔

(رُوم: ۲) نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

اے فرزند ان اسرائیل!
اور دُرُوس دن سے جس میں کوئی کمی
کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس
کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور
نہ شفاعت نہ دے گی۔

يٰۤاِبْنِيْٓ اِسْرٰٓءِيْلَ
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَا تَجِزِيْ نَفْسٌ
عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ
يُنصَرُوْنَ (بقرہ: ۶)

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے پر

نہ رہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی
دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا
کہ اس دن کے آنے سے پہلے جس
میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ
شفاعت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا
مِمَّا رَزَقَكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيْهِ
وَلَا خِلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ
(بقرہ: ۲۴)

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے

اور اعلان میاب کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے —

أَمَّا اتَّخَذَ وَامِنْ دُونِ اللَّهِ
شُفَعَاءَ ط قُلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ
يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ
قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا
لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
شَوْءَ إِلَيْهِ تَرْجِعُونَ (زمر: ۱۵)

کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو
شفیع بنا رکھا ہے۔ کہہ دے کہ اگرچہ
ان کو کسی چیز کا کل چیز کا اختیار نہ ہو
نہ ان کو سمجھ ہو، تو یہ بھی کہہ دے کہ
شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے
اسی کا راجع آسمانوں اور زمین میں ہے

پھر اسی طرف تم لوٹائے جاؤ گے —

اس آیت پاک نے کفار مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی،
دوسری آیت میں عقیدہ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے
بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ
مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا
مَنْ شَرِهَدَ بِالْحَقِّ وَهُوَ
يَعْلَمُ سِرَّاتِ

اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے
ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے
لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی
اور وہ دانش رکھتے ہیں —

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے —

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا
مَنْ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ
عَهْدًا - (مریم: ۶)

یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے
لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے
عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادت حق اور عہد الہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کیلئے اللہ تعالیٰ

کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں،

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَيْنِ

اس کی اجازت کے بعد۔

بَعْدِ اِذْنِهِ (یونس: ۱)

وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَآ

کی شفاعت کر سکے، لیکن اس کی اجازت سے

اَلَا بِاِذْنِهِ ط (بقرہ: ۲۵۵)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی

وَكَوْ مِنْ مَلٰٓئِكٍ فِ السَّمٰوٰتِ

شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ

لَا تَغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا

اس کے بعد خدا اجازت دے جس کو

مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ

چاہئے پسند کرے۔

يَشَآءُ وَيَرْضٰى

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مِنْ اِذْنِ

دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ

لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا

رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

(نبا: ۲۱)

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء

اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا:۔

اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَآ

نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کیلئے

اِلَّا لِمَنْ اِذْنٌ لّٰهُ

وہ شفاعت کی اجازت دے۔

(سبا: ۳)

اس دن شفاعت نفع نہ دے گی

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت

اِلَّا مَنْ اِذْنٌ لّٰهُ الرَّحْمٰنُ

دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند

وَمَرْضٰى لّٰهُ قَوْلًا

کرے۔

(طہ: ۶)

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا۔

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن
اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی
ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ
ارْتَضَىٰ وَهُوَ مِنَ
خَشِيَّتِهِ مُشْفِقُونَ

(انبیاء: ۲)

ترساں ہوں گے —

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کیلئے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے
کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی
شہادت سے محروم ہو گئے۔

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی
شفاعت فائدہ نہ دے گی ظالموں (مشرکوں)
کا نہ کوئی دوست (اس دن ہوگا)
اور نہ کوئی شفیع جس کی ہامانی جائے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ
الشَّافِعِينَ (بدثر ۲) مَالِ الظَّالِمِينَ
مِنْ حَمِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ
(مومن: ۲)

اور وہ بد نصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند ہے گا، مشرکین ہیں
جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ
کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا۔
اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے
بخش دے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ
يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ
ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ
(نساء: ۱۸)

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کر سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس
کی اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرنا خود
خدا کو منظور ہوگا۔ تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا

اسی لئے ارشاد ہوا —

وَأُنذِرُ رِبِّهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ
إِنْ يُجْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ
لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا
شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر)
ان لوگوں کو ہشیار کر دے کہ اس سے ڈرتے
رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے
جائیں گے ان کیلئے ان کے رب کے
سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ
بچتے رہیں —

مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ
قُوٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ

خدا کے سوا تمہارے کوئی حمایتی اور
شفیع نہیں، پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار
بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و
ماہتاب کے گردش اور ان کے سبب سے

اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں۔ اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد
پیدا ہو گیا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب
کے مشرکوں میں بھی پھیلا ہوا تھا وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو
اس شرک سے روکا اور کہا —

لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ | سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

وَمَا يَهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ — ہم کو تو زمانہ مارتا ہے — (جاثیہ: ۳)

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ”فلک کج رفتار“ اور ”دہرنا ہنجار“ کی
شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب
کوئی تباہی توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا کا ہے۔ اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ کا مالک ہوں میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں، یعنی زمانہ جن کو تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ برا کہتے ہیں حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اسی لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نما کے بعد آپ صحابہؓ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے ارشاد ہوا، اُس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مؤمن ہو کر اُٹھے اور کچھ کافر ہو کر جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و کرم سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔

(۱۳) شرک کی ایک نہایت باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے

معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے۔ عربوں میں بُت پرستی کے رواج کے باعث بُتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کُفر تھا، قریش اپنے دیوتا لات و عزّٰی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ لیکن رواج اور عادات کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا جس شخص کی زبان سے لات اور عزّٰی کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ (لے) یہ گویا اس کُفر کے کلمہ

سے تو بڑھے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا: ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو اپنے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چُپ ہے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی۔ ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی بشرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کُفر کیا یا شرک۔

دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں | (۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت

یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید اور صوفیا بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت، عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ توحیدِ کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت

کو واضح کیا کہ مشیت الہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کے تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرزِ کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے صحابہؓ کو روکا۔ اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا، اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا ثابہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے —

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو، کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا، یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے، پھر جو آپ چاہیں۔ یہی واقعہ ابنِ ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد چاہیں، ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپؐ نے فرمایا میں اس فقرہ کی بُرائی جانتا تھا۔ یوں کہو کہ جو خدا چاہے — پھر جو محمد چاہیں —

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام نہ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسولؐ کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے۔ ایک دفعہ آپؐ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثناء میں یہ فقرہ کہا، جس نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی۔ یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپؐ نے اس کو روک دیا اور فرمایا۔ ”اٹھ جاؤ! تم بڑے خطیب ہو!“ آپؐ نے آزر دگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر بڑا اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور

رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے —

(۱۵) جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا

مشبہات شرک کی ممانعت

لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے، مثلاً عبد الشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے آپ کو شاہنشاہ کہا۔ خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔ (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵، ج ۴) غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں اسی طرح غلام نے اپنے مالک کو رب کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور اللہ رب ہے —

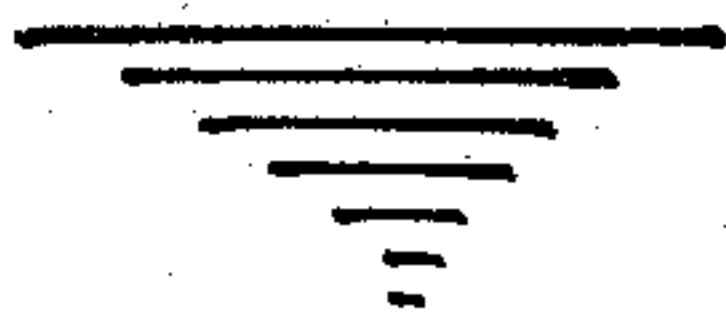
ہانی رضایک صحابی رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابو الحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ نے فرمایا کہ حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے — اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بڑا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اُس نے بڑائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا بڑا

ہو۔ آپؐ نے فرمایا، یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خلکانم لو، تو شیطان دُب کر مگھی کے برابر ہو جائے گا۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے وکنا | (۱۶) شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور

یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنالیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں۔ دُور دُور سے سفر کر کے آتے ہیں۔ قبروں میں مسجدیں بناتے ہیں، منبتیں ملنتے ہیں۔ نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے۔ وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنالیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر اُلٹ دی اور فرمایا کہ خُدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔

(سیرت ابنی)



عقائد

کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیا کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں۔

قرآن پاک نے (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے "قَلْبٌ سَلِيمٌ" (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل "قَلْبٌ أَشِیْعٌ" (گنہگار دل) یہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور تیسرا "قَلْبٌ مُّنِیْبٌ" (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی تھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً تیشگی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

غرض — ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بد اہتہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں اپنے تمام کام انجام دیں۔ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند اصول موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں۔ اس کچھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام جو ایمان سے محروم ہیں بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار
کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ
کی ہے جس پر آندھی والے دن زو
سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی
فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب
بڑی گمراہی ہے —

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ
أَعْمَاءُ لَهُمْ كُرْمٌ مَادِنٌ اشْتَدَّتْ
بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ
لَا يَقْدِرُونَ مِنَ الْمَاءِ كَسْبُوا
عَلَى شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَلُ
الْبَعِيدُ - (ابراہیم ۳)

سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے
کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں —

اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے
کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان
میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے
یہاں تک کہ جب وہ اس کے
پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود
اس کو نظر نہ آئے —

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَكْغَمَاءُ لَهُمْ
كُشْرَابٌ بِقِيَعَةٍ يَحْسَبُهُ
الظَّالِمَانِ مَاءً طَهُرًا
إِذَا جَاءَهُ لَوْ يَجِدُهُ شَيْئًا
(سورہ نور ۵)

.. ..

دورِ حیات میں

شرائی دعوت

مسلمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے مختلف فریضے عائد کئے ہیں۔ اپنے آپ کو خدا کا عبادت گزار بنانے سے لے کر مسلمانوں کی اصلاح تک بہت سی ذمہ داریاں ہیں جن میں مسلمان بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ذمہ داری وہ ہے جس کو اسلامی دعوت یا دعوتِ الی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلم اقوام تک خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچانا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا عنوان نہیں بلکہ پیغمبرؐ کی وراثت ہے جو ختم نبوت کے بعد مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات جس کو جاننا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے درمیان ہم کو دعوتِ حق کا کام انجام دینا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے لئے دعوتِ الی اللہ کا مطلب دورِ شرک کو ختم کرنا تھا، اب ہمارے لئے دعوتِ الی اللہ کا مطلب دورِ الحاد کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے اسلاف دورِ شرک کو ختم کر کے دورِ توحید لے آئے۔ اس کے بعد دنیا میں ایک نئی تاریخ

۱۔ مقدمہ اور مضمون ہذا کو وحید الدین خان کے مقالات سے مقبس کیا گیا ہے۔

وجود میں آئی۔ یہ تاریخ ہزار سال تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی میں مغربی سائنس کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دنیا کی ایک نئی تاریخ بننا شروع ہوئی۔ بیسویں صدی میں آ کر یہ تاریخ اپنے کمال پر پہنچ گئی۔ اب دوبارہ یہ حال ہو گیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے جس طرح فکر و عمل کے تمام شعبوں پر شرک کا غلبہ تھا، اسی طرح اب فکر و عمل کے تمام شعبوں پر الحاد کا غلبہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ آج مذہب بھی علمی طور پر الحاد کا ضمیمہ بن چکا ہے۔ اس سے الگ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

ان حالات میں دعوتِ توحید کا کام گویا خدا کو از سر نو فکر انسانی کے نقشہ پر لکھنا، عالمی سطح پر ایک ایسا فکری انقلاب لانا ہے کہ انسان دوبارہ خدائی اصطلاحوں میں سوچنے کے قابل ہو سکے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ توحید اور آخرت کی بات آدمی کی سمجھ میں آئے اور اس کو وہ حقیقت سمجھ کر قبول کر سکے۔ ہمارے اسلاف نے انسانی فکر کی دنیا میں شاکلہ شرک کو توڑ کر شاکلہ توحید کو قائم کیا تھا۔ اب ہم کو دوبارہ شاکلہ الحاد کو توڑ کر شاکلہ توحید پر انسانی فکر کا نظام قائم کرنا ہے۔ دعوت کے مسئلہ کا اس سے کم تصور دعوت کے مسئلہ کی تصغیر ہے جس کی کوئی قیمت نہ بندوں کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

لٹریچر کی تئاری

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے مسلم کے ذریعے انسان کو تعلیم دی (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ) اس سے اسلامی دعوت کے لٹریچر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسلامی لٹریچر کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر کچھ کتابیں لکھی جائیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح مختلف زبانوں میں چھاپ کر تقسیم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ بشری سطح پر قرآن کی تعلیم فراہم کرنا ہے۔ خدا نے اپنا کلام عربی زبان میں اتارا ہے مگر اس کی تبلیغ دوسری زبان والوں تک

بھی کرنی ہے اور جیسا کہ ثابت ہے، مدعو کی اپنی زبان میں کرنی ہے۔ اس لحاظ سے اگر علم بالقلم کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ابدی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یقینی طور پر انسان اس میں شامل ہو جاتا ہے کیونکہ دوسری زبانوں میں تسلیم بالقلم کا فریضہ انسان ہی کو ادا کرنا ہے۔ خدا کے دین کی دعوت اتمام حجت کی حد تک مطلوب ہے (النساء ۶۵) اسی اتمام حجت کے لئے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ذریعہ معجزے دکھائے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی قوموں کے لئے بھی یہی مطلوب ہے کہ دین کی دعوت ان کے سامنے اتمام حجت کی حد تک پیش کی جائے، پھر موجودہ زمانہ میں اس کا ذریعہ کیا ہے جب کہ پیغمبروں کی آمد اب ختم ہو چکی ہے۔

جدید سائنسی انقلاب اسی سوال کا جواب ہے۔ جدید سائنسی انقلاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دین حق کی تعلیمات کو عین اس معیار پر ثابت کیا جاسکے جو انسان کا اپنا تسلیم شدہ معیار ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اہم ترین بات وہ ہے جو طریق استدلال سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید سائنس نے مختلف میدانوں میں اپنی تحقیقاتی نتیجہ میں اس بات کا قطعی اقرار کیا ہے کہ استنباطی استدلال اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔ یہی قرآن کا طرز استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم انسانی نے قرآن کے طرز استدلال کو عین وہی درجہ دے دیا ہے جو علوم دینیہ سے باہر خوا انسان کا تسلیم شدہ طرز استدلال ہے۔

جدید سائنس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جو پہلے صرف خارجی اطلاع کی حیثیت رکھتی تھی وہ اب خود انسانی دریافت بن چکی ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے کُل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ کائنات میں کئی نظام ہیں۔ اس سے واضح طور پر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ موجودہ

دنیا کے ساتھ ایک اور غیر مرئی متوازی دنیا موجود ہے جس کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ ہے۔ اس کے واضح طور پر عالم آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ —

اسی طرح مقناطیسی میدان اور حرکت کی یکجائی سے بجلی کی روشنی کا پیدا ہونا ویسا ہی ایک حیرت ناک خدائی معجزہ ہے۔ جیسا ہاتھ کو بغل میں رکھ کر لکالنے سے ہاتھ کا غیر معمولی طور پر چمکنا، بڑے بڑے جہازوں کا اٹھنا سمندروں اور ناقابل عبور فضاؤں میں انسان کو لے کر دوڑنا ویسا ہی دہشت خیز خدائی معجزہ ہے جیسا دریا کا پھٹ کر انسانوں کو پار ہونے کا راستہ دینا۔ مادہ سے متحرک مشینوں کا وجود میں آنا ویسا ہی عجیب خدائی معجزہ ہے۔
بیٹا! اٹھی کا سانپ بن کر چلنے لگنا —

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو جو معجزے دیئے گئے وہ سب باعتبار مواد خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔ مگر قدیم زمانے میں چوں کہ وہ انسان کے علم میں نہیں آئے تھے اس لئے آج کے انسان کے یقین و ایمان کے لئے وہی کافی ہیں حقیقت یہ ہے کہ سائنسی انقلاب خدا کے معجزہ کا ظہور ہے۔ اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی تمام اعجازی سطح پر ثابت ہو رہی ہیں۔ اگر ان سے گہری واقفیت حاصل کی جائے اور ان کو دعوت حق کی حمایت میں استعمال کیا جائے تو یہ دعوت کے ساتھ معجزہ کو جمع کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

سائنسی استدلال موجودہ زمانہ میں معجزاتی استدلال کا بدلہ ہے۔ جدید سائنس نے تمام دینی تعلیمات کو علمی طور پر ثابت شدہ یا کم از کم قابل فہم بنا دیا ہے۔ تاہم اسلام کے داعیوں نے ابھی تک اس کو واقعی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔

موافق امکانات

دعوت دین کا کام انتہائی مشکل کام ہے مگر اللہ نے اپنی خصوصی رحمت سے اس کو

ہمارے لئے آسان بنا دیا ہے اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں
کیں جس نے ہمارے لئے نئے مواقع کھول دیئے۔ موجودہ زمانہ میں یہ تاریخی عمل اپنی آخری حد کو
پہنچ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جو کام پہلے "نخن" کے ذریعے کرنا پڑتا تھا۔ اس کو اب
قلم کی سیاہی کے ذریعے انجام دیا جاسکے۔

اس عمل تیسیر کے تین خاص پہلو ہیں جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔
(۱) قرآن میں اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی گئی کہ:۔

ربنا ولا تحمل علينا اصراً	خدا یا! ہم پر وہ بوجھ نہ
کما حملته علی الذین	ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر
من قبلنا	ڈالا تھا)

اگر الفاظ بدل کر اس آیت کی تفسیر کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مطلب
یہ ہے کہ دعوتِ توحید کا کام پچھلے داعیوں کو پابندی رائے کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا، اس کو
ہمیں آزادی رائے کے ماحول میں کرنے کا موقع عطا فرما۔ پہلے زمانہ میں یہ صورت حال تھی کہ
توحید کا اعلان کرنے والے کو پتھر مارے جلتے۔ اس کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے جسم کو آگ
سے چیر دیا جاتا۔ اسی وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم تھی، پچھلے زمانہ
کے بادشاہ کو مفروضہ دیوتاؤں کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے تھے، اس لئے جب کوئی
شخص شرک کو بے بنیاد قرار دیتا تو اس زمانہ کے بادشاہوں کو محسوس ہوتا کہ وہ نظریاتی
بنیاد ختم ہو رہی رہے جس پر انہوں نے اپنی حکومت کو قائم کر رکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے شرک کی اجتماعی
حیثیت کو ختم کر کے اس کو ایک ذاتی عقیدہ توحید کی راہ پر ڈال دیا۔ یہی وہ
بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے:۔

وقاتلوهم حتی لا تكون فتنه ويكون الدين كله لله

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جب توہم پرستی اور شخصی تقدس کا خاتمہ کیا تو نسلی بادشاہت کی بنیادیں بھی چل گئیں، چنانچہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا بالآخر یورپ پہنچ کر جمہوریت کی صورت میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد شخصی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کا اصول دنیا رائج ہوا، اور آزادی رائے کو ہر آدمی کا مقدس حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس عالمی فکری انقلاب نے داعیانِ حق کے لئے یہ عظیم امکان کھول دیا کہ وہ غیر ضروری رکاوٹوں سے بے خوف ہو کر ساری دنیا میں حق کے اعلان کا کام انجام دے سکیں۔

(۲) قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي

الْفُجُورِ وَفِي سُبُلِ مَعَادٍ إِنَّهُ الْخَبِيرُ

(ترجمہ) ہم عنقریب آفاق میں اور انفس میں ایسی نشانیاں دکھائیں گے جس سے کھل جائے گا یہ سراسر حق ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی دلیل ہے، تمام مخلوقات اپنے خالق کی صفات کا اظہار کر رہی ہیں، گویا کائنات قرآن کی دلیل ہے۔ تاہم یہ دلیل سائنسی انقلاب کے پہلے بڑی حد تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی ہوئی تھی، اس دریافت کے لئے ضروری تھا کہ چیزوں کی کھرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے مگر مشرک کا عقیدہ اس تحقیق کی راہ میں مائل تھا۔ مشرک انسان کائنات کے مظاہر کو پرستش کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق کی چیز کیسے بناتا۔

توحید کے عمومی انقلاب نے اس رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اسلامی انقلاب کے بعد کائنات کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب کائنات کے مظاہر پر آزادانہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ یہ کام صدیوں تک عالمی سطح پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ یورپ

پہنچا۔ یورپ میں اس کو موزوں زمین ملی۔ یہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ یہاں وہ عظیم فکری انقلاب ظہور میں آیا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ سائنسی تحقیق کے ذریعے کائنات کے جو حقائق معلوم ہوئے وہ قرآن کی دعوت کو قطعیات کی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔

(۳) اس سلسلے میں تیسری چیز وہ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

عسیٰ ان یبعثک ربک
مقاماً محموداً۔

قریب ہے کہ اللہ تم کو ایک مقام محمود پر کھڑا کرے۔

محمود کے معنی ہیں ”تعریف کیا ہوا“ تعریف دراصل تسلیم و اعتراف کی آخری صورت ہے۔ کسی کو ماننے والا جب اس کو ماننے کی آخری حد تک پہنچتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ایکمیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم شدہ نبوت کے مقام پر کھڑا کرے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں بھی محمود تھے اور آخرت میں بھی محمود۔

خدا کی طرف سے ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ یہ سب سچے پیغمبر تھے ان سب کا پیغام بھی ایک تھا مگر مختلف اسباب سے ان پیغمبروں کو تاریخی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق آج کے انسان کے لئے ان پیغمبروں کی حیثیت نزاعی نبوت کی ہے نہ کہ مسلمہ نبوت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ نبوت ہے، جب کہ دوسرے نبیوں کی نبوت تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں۔ اس بنا پر آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم تسلیم شدہ نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دے سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ متنازعہ نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دینی پڑتی تھی۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں مقام محمود (الاسراء ۹۰) کہا گیا ہے۔ نبوت تاریخی ہی کا دوسرا نام نبوت محمودی ہے۔ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے پیغمبروں کی طرح تاریخی طور پر کوئی نامعلوم شخصیت یا غیر ثابت شدہ شخصیت نہیں ہوں گے۔ بلکہ آپ تمام انسانوں کے لئے پوری طرح ایک معلوم اور معلّم شخصیت ہوں گے۔ آپ کی سیرت بھی ایک محفوظ سیرت ہوگی اور آپ کی تعلیم بھی ایک محفوظ تعلیم —

انسان پیدائشی طور پر اپنی فطرت میں خدا کی طلب لے کر پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کو سچائی کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ انسانی علوم میں اپنی طلب کا جواب دریافت کرنا چاہتا ہے مگر وہ دریافت نہیں کر پاتا، پھر وہ مذاہب کا مطالعہ کرتا ہے تو پاتا ہے کہ موجودہ تمام مذاہب تاریخی پہلو سے غیر محفوظ ہیں۔ انہیں تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔ یہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ انسان سے کہہ سکیں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ محفوظ اور مستند حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے۔ دوسرے کے پاس صرف غیر تاریخی پیغمبر جن کو وہ دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسلام کا پیغمبر مکمل طور پر ایک تاریخی پیغمبر ہے۔ تاریخ کے مسلمہ معیار کے مطابق آپ کے بارے میں کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ دوسروں کے پاس متنازعہ نبوت ہے اور اسلام کے پاس مسلمہ نبوت —

یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے اس نے ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے دین کی دعوت آج مسلمہ نبوت کی سطح پر دی جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف متنازعہ نبوت کی سطح پر دی جاسکتی تھی —

قرآن میں

ساری کائنات کے توحید کی دعوت دینے کا فطری اسلوب

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کیلئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی، اور فطرت پرستی کا رواج نہ تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کیلئے تھی اور علم الہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سر بھر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے

جن میں مُشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا تھا، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لئے ہوئی، اس لئے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لئے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مُشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مُشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشکوکوں اور دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر کی تسکین و تسفی کا سامان بہم پہنچایا —

ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صالح کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوئیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودت ذہن نکھری اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے۔ اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے —

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صالح کائنات کی ہستی کا اعتراف انسانی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مُردہ اور گنہگار قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جس میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھدوٹوں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ آج دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا

کوئی گوشہ، زمانی کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراض بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات داخل ہے۔ اسی لئے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔	فَاقْتُوْا وُجْهَكُمْ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَطَرَتْ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنْ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ
---	---

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اس دبے ہوئے جذبہ کو اُبھارا ہے اور اسی زیرِ خاکِ آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:-

اِنِّی اللّٰهُ شَکُّ فَا طِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم)	کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔
--	--

اور ایک مقام پر اس نے کہا:-

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ بات نہیں ہے) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔	اَمْ خَلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُوَ الْخَالِقُ الْقُوْنُ اَمْ خَلَقُوْا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَا یُوقِنُوْنَ (طور : ۲)
---	---

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے۔ بہر حال موجود ہے اور اس کے وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ

کس کے بنائے وہ کائنات آپ سے آپ بن گئی ہے۔ یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ بن سکتا ہے۔ اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر اور مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اولیں نر و مادہ اور رُوح کا خالق کون ہے۔

یہ گونا گوں عالم — یہ رنگارنگ کائنات — یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین — یہ سورج — یہ چاند — یہ درخت — یہ سمندر — یہ پہاڑ — یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء — یہ علل و اسباب کا تسلسل — یہ تغیر و انقلاب کا نظام — یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون — انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب — موت و حیات کے اسرار — خواص و قویٰ کے رموز اور انسان کی خیالی بلند پروازی — اور عملی عجز و درماندگی۔ یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں — یہ نیلیگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب کا خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

اسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور	إِنَّا فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ
رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں	وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ
کھلے معرفت الہیہ کی نشانیاں ہیں۔	وَالنَّهَارِ لَاَيَاتٍ لِّأُولِي
	الْأَبْصَارِ (آل عمران)

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقرر رفتار و باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اہم پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ وسیع ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ — اور اس کی نشانیوں میں سے رات

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ — | دن اور سورج اور چاند ہیں —
 آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک
 سمندروں میں کس طرح لوگ ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے
 ہیں، اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر یہ لاکھوں من کے
 لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی میں تیر رہے ہیں جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب
 یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں
 سے بخارات اُٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں جہاں
 پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہاں بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر
 کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں —

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ
 وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي فِي
 الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا
 أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
 مَاءٍ فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ
 مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ
 دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَّاحِ
 وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ
 وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
 يَعْقِلُونَ (بقرہ : ۲۰)

بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی
 پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر
 میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں
 کیلئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندروں
 میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے
 پانی برس نے میں اور پھر اس پانی کے
 ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں
 اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں
 کے پھیلائے میں اور ہواؤں کے کبھی
 ادھر اور کبھی ادھر بدلنے میں اور
 آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل
 کام میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کیلئے معرفت الہیہ کی بڑی نشانیاں ہیں

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت
کتنی عجیب ہے —

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً فَأَخْرَجْنَا فِي خَلْقِكُمْ
وَمَا يَبُتُّ مِنْ دَابَّةٍ أَيْتٌ
لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (جاثیہ)

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں
ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں
اور خود تمہاری پیدائش میں جو چلنے والے
پھیلانے ان میں یقین کر نیوالوں
کے لئے توحید کی دلیلیں ہیں —

سورۃ النعام میں نباتات اور ان کی زینگیوں کو پانی کی دلیلیں پیش کیا یہ کہتے
تعب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے
وہ سینچے جاتے ہیں۔ ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ رنگ
پھول، پھل میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ،
ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے ایک دوسرے کے
بالکل الگ ہوتے ہیں —

إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ طِبَابَاتٍ كُلِّ
شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
يُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا
وَمِنَ النَّخْلِ مِنَ النَّخْلِ مِنْ
طَلْحٍ قَنَوَانٍ دَانِيَةٍ وَجَنَّاتٍ
مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ
وَالزَّمَانِ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی
اُتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی
ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے
نکالے، جن سے ہم جوڑے دانے نکالتے
ہیں اور کھجور کے کا بھے میں سے
لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور توتوں
اور انار ہم شکل اور جدا جدا شکل کے
جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور

کو دیکھو بے شک ان میں ایمان والے
لوگوں کے لئے توحید کے بہترین
شواہد ہیں۔

مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوا اِلٰی شَرِّهِ
اِذَا اَشْتَرَّ وَيَنْعِطُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس عورت مرد کے جوڑے ہونے
کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کی اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے، پھر اپنی
قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے
پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کو پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان
جذبات کی لہر ہونا، پھر مختلف قوموں کی زبانیں، شکلیں اور رنگوں کو دیکھ کر ایک ایک
الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو
یہی دلائل تمہاری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ
اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی
بن کر چلتے پھرتے ہو، اور اس کی
نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری
جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ
کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم
سب کے درمیان پیارا اور مہر کھا
اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے
ہیں (دلیلیں ہیں) اور اسی کی نشانیوں
میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناؤ
اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کی

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ کُمْ مِّنْ
تُّرَابٍ ثُمَّ اِذَا اَنْتُمْ بَشَرٌ
تَّتَشَبَّہُوْنَ وَاَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ
خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا
لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْہَا وَجَعَلَ
بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً اِنَّ
فِیْ ذٰلِكَ لَاٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ
وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ السِّنِّیٰتِ
وَالْوَاْنِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰتٍ
لِّلْعٰلَمِیْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَّنَامُکُمْ

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ
مِّنْ فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ
لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ، وَمِنْ آيَاتِهِ
يُنْزِلُ الْبَرْدَ خَوْفًا وَصَلْمًا
وَيَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ، وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ
تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ
بِأَمْرٍ ۚ - (روم: ۳)

بوقلمونی ہے۔ اس میں جاننے والوں
کھلے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب
قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن
میں سونا اور تمہارا اس کی مہربانیوں
کو تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لئے
جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے
عجائب قدرت میں سے یہ بھی ہے کہ
تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے
جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی حریت
کی بارش کی امید رکھتے ہو اور وہ
آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں
اور اس کی دیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے اپنے اپنے
مقام پر قائم ہیں

اس آخر آیت میں آسمان اور زمین کے اس حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ
باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں۔ لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ
خود حیرت انگیز نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے بلاکسی نظرنہ
آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے
یہ نظرنہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی ہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اثر میں سے ہے، اس کے بعد
ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی
کے نمونوں کا ابھرنا کتنا حیرت ہے، یہ بھی اس کی قدرت کا ثمرہ ہے۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ ۚ - اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے

تَرَوْهَا وَالْقَىٰ فِي الْأَرْضِ
رَأَوْا سَيِّئًا أَن تَسِيدَ بِكُودُ
بَيْتٍ فِيهَا مِنْ كُلِّ ذَاتِ طَيْرٍ
وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ
شَرَابٍ كَرِيمٍ۔ (لقمان: ۱)

ستوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر
آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے
ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ابل نہ جائے
اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے
پھرنے والے پھیلانے اور آسمان
سے پانی برسایا، پھر ہم نے اسی زمین

سے ہر چیز کے اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورہ بقرہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) سے ذریعہ
توالد و تولد، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مُردہ قالب میں دفعۃً کہیں
سے زندگی کا آجانا اور اس میں رُوح کا داخل ہو جانا اور اس میں علم کا حواس کے حیرت انگیز
اکات کا پیدا ہو جانا۔ ان سب کو اپنی صنعت میں پیش کیا ہے۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ
خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ
مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ
مَّهِينٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ
مِنْ رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ
السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ
قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (سجده: ۱)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور
انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی
پھر اس کی نسل پتھرے پانی سے بنائی پھر
اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنے جسم
سے رُوح کو داخل کیا اور تھامے لئے
کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے
تم ہمارے ان احسانوں کا بہت
ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔

مُردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں و رلیت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں
عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحبِ نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی

اس کے اندرونی جذبات، جو اس، ذہنی قوی اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ
وَفِي الْفُسْكَوٰ۟ا۟ فَلَا تُبْصَرُو۟نَّ
(ذاریات: ۱)

اور زمین میں یقین کرنے والوں
کیلئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری
جانوں کے اندر بھی نشانیاں ہیں کیا

تم نظر نہیں کرتے

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے ایک
ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون
اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی
رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا لکنا کتنا عجیب ہے۔

اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت
ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر
سے لید اور خون کے درمیان سے
پینے والوں کے لئے خالص اور
نوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

وَإِنَّ لَّكُمْ فِي الْأَنْعَامِ
لَعِبْرَةً ۚ نُّسْقِيكُم مِّمَّا
فِي بُطُونِهِمْ مِنْ بَيْنِ
فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا
سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ (نحل: ۹)

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو
بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو عقل کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسے انگور سے شراب
بنائیں تو اس سے عقل پر بڑا اثر پڑتا ہے

اور چھوہاروں اور انگوروں کے
پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم
نشد اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو
اس میں عقل سے والوں کیلئے

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ
وَالْأَعْنَابِ يَتَّخِذُونَ مِنْهُ
سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۚ إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ

يَعْقِلُونَ - (نحل: ۹) — بہترین دلیل ہے —
 زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو پھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چرخ
 اور چاند کی خوشنما قدیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے
 بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے —

سَبَّحَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي	بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں
السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ	میں برج بنائے اور ان میں ایک چرخ
فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (فنا)	اور چمکانے والا چاند بنایا —

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے
 اپنی خلقت، اپنی حکم روشن اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے —

صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي اَلْقَىٰ	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر
كُلَّ شَيْءٍ (نمل: ۷)	شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں استحکم نظم و نسق کی بندش
 نظر آتی ہے —

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ	تجھے اس خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری
مِنْ تَفْوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ	نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطو
هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ	دکھائی پڑتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر کر
ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ	تیری نگاہ تھک کر تجھ تک پلٹ کر آئیگی
إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَا سِئًا وَهُوَ	مگر ہماری اس بناوٹ میں کوئی
حَسِيرٌ - (ملک: ۷)	نقص نہ پا سکے گی —

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصاء بھی مشکل ہے۔ ان آیتوں میں
 تین قسم کے دلائل ہیں —

۱ — قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲ — عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب شدہ سلسلہ —

۳ — کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں

کا ہونا —

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانہ اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے —

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بدابہتہ دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے اسباب کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے کے غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل علق لا بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا بھی ضروری ہے جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود کی اصلی علت العلل ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا مانو مذکور ہے۔ سورہ ہود کے آخر میں ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں
وَالْيَدِ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلَّهُ فَاعْبُدُوْهُ | اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی
وَكُوْنُ كُلِّ عَلِيْهِ (ہود۔ ۱) — | طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس

کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو —

وَ اَنْتَ اِلٰہِ رَبِّکَ | یہ کم ترے رب کی طرف
الْمُنْتَهٰی - (نجم) | ہر چیز کی انتہا ہے —

دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو زبان پر لانا اسے گناہ سمجھے، یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے اَصْنَتْ بِاللّٰہِ ————— میں اللہ پر ایمان لایا۔

یہ تسلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں۔ یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔ اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک دو نہیں۔ تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں، جو دو

توحید پر عقلی دلیلیں

تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہمی توافق، تعاون و اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اُس وقت تک اُگ نہیں سکتا جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو۔ آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق نہ پہنچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا، اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے —

اگر زمین و آسمان میں اس ایک
خدا نے برحق کے سوا اور خدا بھی موجود
ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے
اے عرش والا خدا تو ان باتوں سے پاک ہے جو مشرک لوگ آپ کے بار میں کہتے ہیں۔

آسمان وزمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے۔

فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے اس کی کوئی علت تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔

اب عالم کی علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری علت تامہ ہوگی۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پاتھ کو دیکھو تو معلوم ہوگا سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سبب و مسبب نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق رہی ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذْ أَتَىٰ نَارَ الْآدَمِ ۚ

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی

لَذَٰهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ
وَلَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ

بَعْضٍ — (مومنون : ۵)

اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا
اپنی مخلوق کو الگے جاتا اور ایک
دوسرے پر چڑھ جاتا —

قُلْ لَّوْكَانَ مَعَ الْهَةِ كَمَا
يَقُولُونَ إِذْ الْأَبْتَخَوْا إِلَىٰ
ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا سُبْحَنَهُ
وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا
كَبِيرًا، تَسْبِيحُ لَهُ السَّمَوَاتِ
السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ
فِيهِنَّ ط إِنَّ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا
يُسَبِّحُ بِحَمْدٍ (ابن اسریل : ۵)

کہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور
خدا ہوتے جیسا کہ (یہ مشرکین) کہتے
ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے
(حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا
راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے
وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک)
کہتے ہیں۔ اس (خدائے برحق) کی
پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو

ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی
گواہی نہ دیتی ہو —

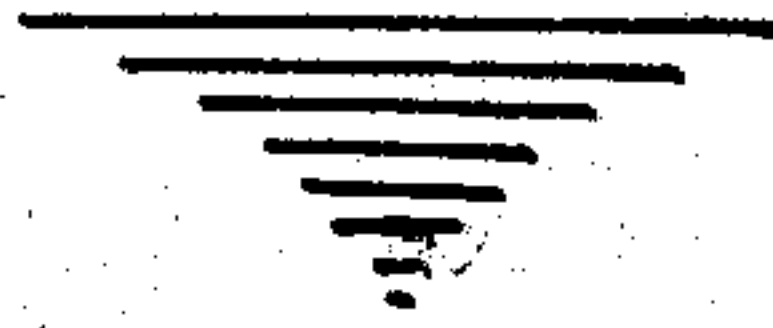
اسی وحدت نظام کے استدلال کو خدائے تعالیٰ نے ایک آیت میں بیان فرمایا ہے

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ
مِنْ تَفَوتٍ فَإِنْ رَاجِعِ
الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ
شَوْا رَاجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ
يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ
خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (ملک)

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں
دیکھتا، پھر لگا کر، کیا کوئی فطرت
کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر
دوڑا، تیری نظر رد ہو کر تھک
واپس آجائے گی —

اس واقعائی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی

دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے۔ ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی لئے اس دنیا کے حاکم و فرماں روا نے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے —



خُل کی ہستی کے آفاقی دلائل

کائنات کا ربّ العالمینی نظام شہادت دے رہا ہے کہ ہمارا اور ساری کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہی اپنی قدرت اور اپنے حکم سے اس سارے جہان کو چلا رہا ہے، اگر کوئی شخص بنیاد ہی کو نہ مانے تو اس کے نزدیک دین کے سلسلہ کی تمام باتیں بیوقوف انسانوں کے "توہمات" ہیں۔۔۔۔۔ بہر حال خدا کی ہستی کا مسئلہ دین مذہب کا پہلا بنیادی مسئلہ ہے، اور کوئی دینی دعوت اُن ہی لوگوں کو دی جا سکتی ہے جو پہلے اس بنیاد کو تسلیم کر لیں مگر چونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کے لئے خود اپنی ہستی کے علم کی طرح بالکل فطری اور بدیہی ہے جس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ ہمارے اس دور میں بھی جس کو لادینیت اور دہریت کا دور کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی غالب ترین اکثریت خدا کی ہستی کی ماننے والی ہی ہے۔۔۔۔۔

اس سلسلے میں یہ ایک بات پہلے سمجھ لینے کی ہے کہ قرآن پاک خدا کی ہستی (اور اسی طرح دوسری ایمانی حقیقتوں) کو منوانے کے لئے منطقیوں کے طریقے پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا ہے جس کے مقابلہ میں مخاطب اگرچہ لاجواب ہو جائے، لیکن اس کے دل میں اس سے یقین کی ٹھنڈک پیدا نہیں ہو سکتی، بلکہ قرآن پاک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی صحیح اور سلیم فطرت سے اپیل کرتا ہے کہ کائنات کا نظام جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو بلکہ تم خود اسی کے ایک جزو ہو، اس میں ذرا غور و فکر کرو، تم خود حقیقت کو پا لو گے اور جو تم کو بتلایا جا رہا ہے اُس کی کھلی نشانیاں بحشم خود دیکھ لو گے، اور تمہارا یہ غور و فکر اور

مطالعہ یقین و اطمینان کی ٹھنڈک تمہارے دلوں میں پیدا کر دے گا —
 شرآن میں ہے: —

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
 اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
 الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ
 بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا
 أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
 مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ
 بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَيَّنَّ فِيهَا
 مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ
 الرِّيَّاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
 بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
 لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

(البقرہ - ع - ۲۰)

بلاشبہ آسمان و زمین کی ساخت میں
 اور رات دن کے یکے بعد دیگرے
 آنے میں اور ان کشتیوں میں جہاز
 میں جو انسانوں کے کام کی چیزیں
 لے کر ریاؤں اور سمندروں میں چلتے
 پھرتے ہیں، اور اس بارش میں جسے
 آسمان سے برساتا ہے پھر اس زمین
 کو ایک زندگی بخشتا ہے، بعد اس کے
 کہ وہ مردہ ہو چکی ہوتی ہے اور اسی کے
 ذریعہ ہر قسم کے جاندار زمین میں پھیلا
 دیتا ہے، اور ہواؤں کے بدلنے میں
 اور ان بادلوں میں جو آسمان زمین
 کے درمیان مسخر رہتے ہیں (توان

سب چیزوں میں جن کو سب آنکھوں والے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتے
 ہیں) عقل سے کام لینے والے لوگوں کے لئے خدا کے وجود پر کھلی نشانیاں ہیں

قرآن مجید نے یہاں آسمان و زمین کی ساخت، رات دن کی آمد و رفت کے معر
 نظام، سمندروں میں، جہازوں کی چلت پھرت، بارش اور اُس کے آثار و نتائج، ہواؤں
 کے تغیرات، اور آسمان و زمین کے درمیان ایک خاص نظام کے تحت رہنے والے

بادلوں کی طرف اشارہ کر کے انسانوں سے کہاہے کہ ان چیزوں میں غور کرو، اگر تم عقل سلیم
کام لوگے تو ان میں ہر چیز تمہیں زبان سے صاف صاف بتائے گی کہ وہ جو کچھ ہے اور جس
حال میں ہے آپ سے آپ نہیں بنی بلکہ کسی حکیم و خیر اور کامل القدرت ہستی نے اُسے ایسا بنا
دیا ہے ————— پھر سورۃ النعام میں ارشاد ہے : —————

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَآفَىٰ تَوْفَكُونُ ۝ (النعام: ۱۲)	یقیناً اللہ ہے دانے اور گٹھلی کا پھارنے والا، وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا، یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے پھر تم کہ صبر بیکے چلے جا رہے ہو
---	--

قرآن کہتا ہے کہ تم دیکھتے ہو کسی اناج کے ایک دانے یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے، نہ اُس دانے یا گٹھلی میں کوئی شعور و احساس ہے، نہ زمین، اور نہ ان میں سے کسی میں ارادہ کی کوئی طاقت ہے، یہ سب چیزیں بے جان ہیں لیکن پندلوں کے بعد نظر نہ آنے والی طاقت کا مخفی ہاتھ زمین کے اندر ہی اندر اُس دانے اور گٹھلی کو پھاڑتا ہے، اور اُس میں سے نہایت نرم و نازک ایک ریشہ نکلتا ہے، پھر وہ اپنے اُوپر والی مٹی کی تہوں کو چیرتا ہوا اُوپر نمودار ہو جاتا ہے، تو ذرا سوچو کہ مٹی میں دفن شدہ اس جان دانے یا گٹھلی کو کس نے پھاڑا، کس نے اُس میں سے وہ جاندار اکھوانکالا، پھر سوت کے دھاگے جیسے نرم و نازک اس اکھوے نے کس کی طاقت سے زمین کو پیر ڈالا۔؟ کیا تمہاری عقل میں آسکتا ہے کہ اُس بے جان دانے، یا گٹھلی نے یہ سارے کام خود کر لئے یا بغیر کسی کرنے والے کے آپسے آپ یہ سب کچھ ہو گیا ————— ہرگز! یہ سب ایک حکمت و قدرت والی ہستی نے کیا اور وہ ہستی خدا کی ہستی ہے (إِنَّ اللَّهَ خَالِقُ

الْحَبِّ وَالنَّوَى) —————

اور اُس کی قدرت صرف بے جان دانے اور گٹھلی ہی کے ساتھ یہ عمل نہیں کرتی ہے بلکہ اور بھی کتنی بے جان چیزوں سے وہ جاندار چیزیں پیدا کرتا ہے، اور اسی طرح کتنی ہی جاندار چیزوں سے بے جان چیزوں کو برآمد کرتا ہے — اور تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو، مثلاً بے جان انڈوں سے جاندار بچوں کا نکلنا بھی دیکھتے ہو اور جانداروں میں سے بے جان مادوں کے برآمد ہونے کا بھی مشاہدہ کرتے ہو — خدا کی قدرت کی یہ کسی کھلی کھلی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں، پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیوں اور کدھر بہک رہے ہو — اور سورۃ رعد میں ارشاد ہے : —

اور دیکھو! زمین میں مختلف قطعے ہیں جو باہم ملے ہوئے اور پاس پاس ہیں، اور انگوروں کے باغات ہیں اور غلہ کے کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جو جڑ سے دوسرے درخت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور کچھ ایسے جو اس طرح جڑے نہیں ہوتے، ان سب چیزوں کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، اور پھر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم مزہ میں فوقیت دیتے ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے —	وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَجَوِّدَاتٌ وَجَنَّتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَيْتُونٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفِصِّلُ بَعْضَهَا عَلَى الْبَعْضِ فِي الْأَكْلِ طَائِفٌ ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝
--	--

(سورۃ رعد - غ - ۱)

کیا جاتا ہے، اور پھر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم مزہ میں فوقیت دیتے ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے —

قرآن کہتا ہے، زمین جس پر تم چلتے ہو اور جس سے تمہاری غذا پیدا ہوتی ہے، ذرا اُس کی اس حالت پر تو غور کرو، کہ اُس کے باہم ملے ہوئے قطعوں میں بسا اوقات کیسا

کیسا فرق ہوتا ہے، ایک نیا دہ پیداوار والا ہے۔ دوسرا کم پیداوار والا، ایک مثلاً کھجور کی کاشت کے لئے زیادہ مناسب ہے اور دوسرا مثلاً کپاس کی کاشت کیلئے پھر کسی ٹکڑے میں انگور کی بلیں ہیں اور اُن سے انگور اُترتے ہیں اور اسی کے برابر والے دوسرے ٹکڑے میں مثلاً غلہ کا کھیت ہے جس میں سے غلہ پیدا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی تیسرے ٹکڑے میں کھجور کے درخت ہیں اور وہ بھی سب یکساں نہیں، بلکہ مختلف طرح کے ہیں، الگ الگ اکہرے اکہرے بھی ہیں، اور ایک ہی جڑ سے نکلے ہوئے کئی کئی جڑے ہوئے بھی ہیں — پھر حال یہ ہے کہ سب کو ایک پانی ملتا ہے، ایک ہی ہوا لگتی ہے، ایک ہی سورج کی شعاعیں سب پر پڑتی ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی ظاہری شکل و صورت کے علاوہ اُن کے ذائقوں میں بھی کتنا فرق ہے — کیا یہ فرق، یہ چھوٹا بڑائی، اور یہ اونچ نیچ آپ سے ہے، کسی ارادہ اور قدرت کے عمل کے بغیر یہ یوں ہی خود بخود ہو رہا ہے؟ ہرگز نہیں! قطعاتِ زمین کے اس کیفیاتی فرق و اختلاف میں، اور اس کی پیداوار کی اس رنگارنگی میں عقل و بصیرت کے کام لینے والے کیلئے کھلی نشانیاں موجود ہیں جن سے وہ اصل حقیقت کے بارے میں یقین حاصل کر سکتے ہیں۔ اور جس کی حکمت و قدرت کے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اُس کو جان سکتے ہیں — اور سورہ عبس میں ارشاد ہے :-

انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے اور
اُس میں غور کرے، ہم پہلے زمین پر
پانی برساتے ہیں، پھر اُس زمین کی
سطح کو شق کرتے ہیں، پھر ہم اُس میں
غلہ، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور
کے درخت اور گنجان باغ اور میوے
اور جانوروں کیلئے چارہ پیدا کرتے ہیں

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى
طَعَامِهِ إِنَّا نَحْبِبُهُنَّ الْمَاءَ
صَبَّأً شَوْ شَقَقْنَا الْأَرْضَ
شَقًّا فَاَنْتَبْنَا فِيهَا حَبًّا
وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا
وَخَلًّا وَحَصَدَاتٍ عَلَبًا
وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (سورہ عبس)

پس ہماری پیدا کی ہوئی ان غذاؤں کو استعمال کرنیوالے انسان کو چاہیے کہ وہ سوچے کہ یہ غلہ جس سے تیار کی ہوئی روٹی میں کھاتا ہوں اور یہ طرح طرح کے میوے اور یہ پھل اور ہمارے جانوروں کے کام آنے والے یہ چارے، یہ سب چیزیں کہاں سے آتی ہیں اور کون ان کو پیدا کرتا ہے، جس پانی سے یہ سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کون برساتا ہے اور پھر کسی کے حکم اور کسی کی قدرت سے زمین کے اندر دبے ہوئے دانوں یا گٹھلیوں سے ان چیزوں کے پودے اُگتے ہیں، اور بالکل ابتداء میں زمین میں سے ان پودوں کے نکلنے کے لئے کون سطح زمین کو ان کے واسطے چیر دیتا ہے — تو انسان اگر حقیقت کا طالب بن کر اپنی غذا ہی پر غور کرے گا تو حقیقت کو پالے گا اور غذا کے خالق کا، اور اُس کی قدرت و حکمت کا اس کو علم حاصل ہو جائے گا — اور سورۃ نحل میں ارشاد ہے: —

اور تمہارے لئے تمہارے موشیوں میں بھی غور و غیرت کا سامان ہے، ہم تم کو اُن کے پیٹ میں سے خون اور غلیظ گوشت کے درمیان سے پاک صاف دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کیلئے بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً لِّتُسْقُوا مِنْ مَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ۝
(سورۃ نحل - ج - ۱۹)

قرآن کہتا ہے کہ جن موشیوں کا تم دودھ پیتے ہو ذرا اُن ہی میں تم غور کرو، اُن کے پیٹ میں خون کی نالیاں ہیں، غلیظ فضلہ کے رہنے کی جگہ اور اُس کے راستے ہیں، اور کوئی لحم ایسا نہیں ہوتا کہ ان موشیوں کے جسم میں سُرخ ناپاک خون اور بدبودار غلیظ فضلہ کی کافی مقدار بھری نہ رہتی ہو، لیکن ان موشیوں کے جسم کے جن حصّوں میں خون اور فضلات بھری رہتی ہے اُسی کے قریب لطیف اور صاف دودھ نکلتا ہے جس میں نہ خون کے رنگ کا کوئی شائبہ ہوتا ہے، اور نہ غلیظ فضلہ کی بدبو کا کوئی اثر، وہ پینے والوں کیلئے

کیسا خوشگوار، خوش ذائقہ اور نفیس مشروب ہے، تم خود اس کو جانتے ہو۔ —
 تو ذرا سوچو، کہ یہ کس کی کاریگری ہے، کیا جس کائے یا بھینس میں سے یہ دودھ نکلتا ہے
 یہ اُس کا فعل ہے؟ کیا کوئی انسانی عقل دودھ کی یہ عجیب و غریب شین بنا سکتا ہے کہ
 اس میں گھاس ڈال ڈال کر اس سے دودھ نکالتا رہے، ہرگز نہیں! —
 اور ایک موقع پر سوالیہ انداز میں "خدا کی ہستی" ہی کے متعلق نہایت مختصر لفظوں
 میں کتنی بلیغ بات کہی گئی ہے، ارشاد ہے: —

کیا تمہیں اُس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان و زمین (اور ساری کائنات) کا بنانے والا ہے۔ —	أَفِی اللّٰهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ ابراہیم - ۵-۶)
--	---

اس مختصر سے سوالیہ جملہ کے ذریعہ قرآن پاک نے انسانوں کے غور و فکر کیلئے اُن کے
 سامنے زمین و آسمان کی ساری وسعتیں رکھ دی ہیں۔ — آنکھوں والا انسان آسمان
 کو دیکھتا ہے، چاند سورج، ستاروں کو دیکھتا ہے، اُن کی روشنی اور اُن کی گرمی یا ٹھنکی کو
 دیکھتا ہے، زمین کو اپنے نیچے پاتا ہے، اس میں باغات دیکھتا ہے، کھیتیاں دیکھتا ہے
 اُس سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور اُن کے عجیب و غریب
 خواص اور منافع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ — پھر جب تک کہ اس کی عقل بالکل مسخ
 نہ ہو جائے وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ سب چیزیں خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے ایسی بن گئی
 ہیں، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کسی فلسفہ یا صنّاع انسان کی فلسفہ دانی یا کاریگری کے یہ سب کچھ
 ہیں، اُس کی سلیم عقل و بصیرت اس کے ہوا کسی توجیہ کو قبول ہی نہیں کر سکتی، کہ یہ سب کسی حکیم
 و خیر ہستی کی قدرت اور صنعت کا کرشمہ ہے۔ —

اور سورۃ ذاریت میں ارشاد ہے: —

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِی الْفٰسِکُوْۤا فَلَآ تُبْصِرُوْنَ
 (ذاریت - ۵-۱)

(ترجمہ) اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی نشانیاں موجود ہیں، پھر کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا!

یہاں انسانوں سے کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں ہماری قدرت کی جو نشانیاں ہیں ان کے علاوہ خود تمہارے وجود میں ہماری نشانیاں موجود ہیں، تم اگر اپنی بصیرت سے کام لو، تو اپنے وجود اور اپنے نظام زندگی میں غور کر کے یقین حاصل کر سکتے ہو۔ —

واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر صرف اپنے وجود، اپنے اعضاء اور اپنے نظام زندگی ہی پر غور کرے تو فاطر ہستی کے بارہ میں اُسے ہرگز کوئی شک شبہ نہ ہے، وہ اپنی ابتداء کو سوچے، رحم مادر میں میری یہ صورت کس نے بنائی — ؟ میرے قالب میں یہ رُوح کہاں سے آئی ہے — ؟ میری زندگی کے یہ سامان کس نے پیدا کئے؟ میری آنکھ میں روشنی کس نے ڈالی — ؟ میرے کان کے پردوں میں آوازیں سننے کی قابلیت کس نے رکھ دی — ؟ میری ناک کے غدودوں کو خوشبو اور بدبو کا یہ احساس کس نے دیا — ؟ میری زبان اور میری تالو میں یہ چٹخارہ اور ذائقہ کس نے رکھ دیا، جس سے کھانے پینے کے سارے لطف ہیں — ؟ اور مجھے یہ گویائی کی قوت کس نے دی؟ — کیا میرے ساتھ یہ مہربانیاں میری ماں نے کیں، میرے باپ نے کیں — ؟ کیا میرے ان کاموں کیلئے کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئیں — ؟ کیا میں نے خود اپنے آپ کو ایسا بنالیا — ؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، اور یہ سوچنا تو اور بھی زیادہ غلط ہوگا کہ میں اپنے یا کسی اور کے ارادہ کے بغیر ہی آپ سے آپ ایسا بن گیا —

پس! حقیقت اس کے ہوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بڑی حکیم و خیر اور بڑی کامل القدرت ہستی نے مجھے پیدا کیا ہے، اور یہ سب مہربانیاں میرے ساتھ اُسی نے، اور صرف اُسی نے کی ہیں — فَبَارِكْ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ — (از: مولانا محمد منظور لکھنوی)

توحید کا قرآنی تصور

مولانا آزادؒ اپنی تفسیر ”اُمُّ الْکِتَاب“ میں لکھتے ہیں: —
 تجسم اور تنزیہ کے لحاظ سے قرآن کا تصور تنزیہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود
 اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن
 انسانی متحمل ہو سکا تھا یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جائے
 لیکن جہاں تک صفات الہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور
 جسم و ہئیت کے تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا، ہندوستان اور یونان کا یہی حال
 تھا۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی وہ بھی اس طرح
 کے تشبہ و تمثیل سے بکرا آلودہ ہے۔ —

خدا کا حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت
 موسیٰؑ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوش غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا،
 بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالینا اور اُس کی بدچلنی پر تم کرنا۔ ہیکل کی تباہی پر اُس کا نوحہ،
 اُس کی انگریزوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا۔ —

اللہ کے بارے میں یہودیوں کی توریت میں یہی تصورات بیان کئے گئے ہیں۔
 اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فخر انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ تمثیل کا پردہ
 ہٹا کر صفات الہی کا جلوہ دیکھ لیتا، اس لئے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہ ہی پر

رکھنی پڑی، مثلاً توریت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یسعیا کی کتاب میں خدا کے لئے شانستہ صفات کا تخیل موجود ہے لیکن دوسری طرف خدا کا مخاطبہ ایسا نہیں ہوتا جو نہ اسر انسانی اوصاف و جذبات کی تشبیہ سے مملون ہو —

لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر و تصور کی ایک نئی دنیا سامنے آگئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے بیک دفعہ اٹھ جاتے ہیں —

انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت منقوہ ہو جاتی ہے۔ ہر گوشہ میں حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسیم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہ کمال کے اس مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے کہ: —

اُس کے مثل کوئی شے نہیں کسی چیز
سے بھی تم اسے مشابہ نہیں کھڑا سکتے
انسان کی نگاہیں اسے نہیں سکتیں
لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو
دیکھ رہا ہے —

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ
لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ
وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارُ
وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ •
(القرآن)

اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے
اسے کسی سے احتیاج نہیں۔ نہ تو اس
سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ
الضَّمَدُ ۝ لَوْ يَلِدُ وَلَوْ يُؤَلَّدُ
وَلَوْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ

پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی ہستی اس کے درجہ میں برابری کر سکتی ہے —

توریت اور قرآن کے جو مقام مشترک ہیں دقت نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو، توریت میں جہاں کہیں خدا کی براہ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے قرآن وہاں خدا کی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ توریت میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا مشکل ہو کر اُترا۔ قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا۔

کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا

البتہ یاد رہے کہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک بشری عقل کی رسائی ہے، صفات الہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہ کے منعی و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لئے کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ (ہنود کے فلسفہ میں بلاشبہ اوپیشد تنزیہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دُور تک لے گئے، لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نامہ ذاتِ مطلق (برہما) کو ذاتِ مشخص (ایشور) میں اُتارے بغیر کام نہ چل سکا

۵۔ بنتی نہیں ہے بادۂ مُساعر کہے بغیر

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفیِ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ دونوں تصور انسانی کے لئے ٹھوکر کا باعث بن گئے۔ اگر تشبہ اسے حقیقت سے نا آشنا کر دیتا ہے تو تعطیل اسے عقیدہ کی روح محروم کر دیتا ہے پس ضروری ہوا کہ افراط و تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبہ اور تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے، چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے اگر خدا کے تصور کے لئے صفات و افعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی گرفت میں آسکتی ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہ کے معنی نفی و جود کے ہو جائیں گے یعنی اگر کہا جائے کہ ہم خدا کے لئے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آجائے گی تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکر انسانی کے لئے کوئی سررشتہ تصور باقی نہیں رہے گا اور وہ کسی ایسی ذات ذات کا تصور ہی نہیں کر سکے گا۔ اور جب تصور نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی گرفت اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصور اگرچہ اثباتِ جود کی کوشش بھی کرے،

لیکن فی الحقیقت وہ نفی کا وجود کا تصور ہوگا، کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعہ ہم ہستی کو نفی سے جدا نہیں کر سکتے۔

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے۔ اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصور ایک فلسفیانہ تخیل ضرور پیدا کرے گا، لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہ کو اُس کے کمال درجہ پر پہنچا دیتی ہے دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچالے جاتی ہے وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا احسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فہم میں آ سکتی ہے مثصف ہے وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے دیکھنے والا ہے، سننے والا، سب کچھ جاننے والا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آ سکتی ہے (۱) وہ عظیم المثال ہے۔ لیس کمثلہ شئیؑ

(۲) تمہاری نگاہ اُسے پا ہی نہیں سکتی لا تدرك الا بصار (۳) تم اُس کے لئے اپنے تخیل سے مثالیں نہ گھرو۔ فلا تدبروا اللہ الا مثال پس ظاہر ہے کہ اُس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا، اُس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہو سکتی، اُس کا دیکھنا، سُننا اور جاننا ویسا نہیں ہو سکتا، جس طرح کچھ دیکھنے سُننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں، اُس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطہ کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً اُس کا مطالب وہ نہیں ہو سکتا، جو ان الفاظ کے مدلولات ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتے ہیں۔

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں۔ ایک کو "محکمات" سے

تعبیر کیا ہے۔ دوسری کو "متشابہات" سے محکمت سے وہ آئیں مقصود ہیں جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آسکتی ہیں اور اُس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کیلئے ایک سے زیادہ معانی کا ان میں احتمال نہیں۔ متشابہات وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اُس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے۔

صفاتِ الہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سودمند نہیں ہو سکتیں بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ یہاں سبج تفویض کے چارہ کار نہیں۔
(تفسیر سورۃ الفاتحہ ۲۱۹)

قرآن میں شریک تصور کا حتمی انسداد

جہاں تک توحید اور شرک کا تعلق ہے۔ قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے پلک ہے کہ اُس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اُس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں اگر کوئی دوسری ہستی اُس کی ذات میں شریک و سہیم مان لی جائے۔
ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور سلبی یہ ہے کہ اُس کی مانند کوئی نہیں اور جب اُس کی مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفات اُس کے لئے مخصوص ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو، پہلی بات کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی تکمیل

ہو سکتی، اس لئے ان مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات
اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔ —

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزبٹوں
کے تمام دروازے بند ہو گئے، اُس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں
بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اُس کی خصوصیت ہے۔ —

وہ کہتا ہے ہر طرح کی عبادت اور نیا کی مستحق صرف خدا ہی ذات ہے۔ پس
اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے ساتھ سر جھکایا تو توحید الہی کا
اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے یہ اُس کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی
دُعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری
ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اس طرح
عظمتوں، کبریائیوں، کارسازوں اور بے نیازوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی
کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی
اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اُسے خدا کا ندّلعنی شریک بٹھرا لیا
اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ —

یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کی تلقین کی
گئی اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ
مفعول کو بھی مقدم کیا جو مفید حصہ ہے یعنی ”صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف
تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں“۔ —

اُس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردّ
اشراک پر زور دیا گیا ہے شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔ —

مقام نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقام نبوت کی حد بندی کا تھا یعنی نبی کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سد باب ہو جائے، اس بار میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور عبدیت پر زور دیا ہے محتاج بیان نہیں، ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے —

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ	یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے
وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ	سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار
وَرَسُولُهُ	کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں — اس اقرار میں جس طرح خدا کی تعریف کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبدیت اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا، صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلام کی عبدیت اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو —

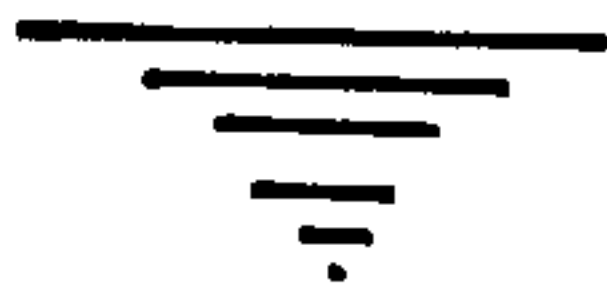
ظاہر کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا جاسکتا تھا؟ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی پیغمبر اسلام کی عبدیت کا بھی اقرار نہ کر لے — یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ان کی شخصیت

کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی اُن کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا —

من کان منکم یعبّد محمدًا فان محمّدًا قد مات ومن کان منکم یعبّد اللّٰه فان اللّٰه حیّ لا یموت	جو کوئی تم میں محمّد کی پرستش کرتا تھا سو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ محمّدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللّٰہ کی پرستش کرتا تھا تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللّٰہ
---	---

————— (بخاری)

کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں —
(تفسیر سورۃ الفاتحہ ص ۲۳۱)



توحید کے

شرائی برائین

مفکر اسلام عباس محمود العقاد اپنی کتاب ”اللہ“ میں لکھتے ہیں: —
 اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کر نیوالے دلائل آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی اس
 قدر تکرار کے ساتھ نہیں آئے جس قدر قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں —
 منکرین وجود الہی کے مقابلہ میں اس قدر اشارے نہ تورات میں ملتے ہیں نہ انجیل میں
 کیونکہ انبیائے تورات کے سامنے تمام تر وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل کے معبود پر ایمان
 رکھتے تھے اور وہ اس کے وجود کے منکر نہ تھے، اس لئے انبیاء کی تحکیم کا روئے سخن یہ
 نہ تھا کہ وہ کسی منکویا متر و ذکر وہ کو خدا کے وجود پر مطمئن کریں۔ بلکہ ان کی تبلیغ کا روئے سخن
 صرف اس قدر تھا کہ وہ قوم کو خدا کی ناراضی سے ڈراتے اور غیر اللہ پر ایمان لانے کے
 بُرے انجام سے خوف دلاتے اور خدائی وعدہ وعید کو یاد دلاتے —
 کیونکہ بنی اسرائیل ”یاہواہ“ کو اپنا ہی معبود سمجھتے تھے اور اس میں کسی غیر کی شرکت
 کو پسند نہ کرتے تھے۔ نہ اس معبود کے ساتھ وہ کسی اور معبود کی شرکت گوارا کرتے تھے
 وہ پُرانے زمانے سے معبود پرستی کا یہی تخیل قائم کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے یہ
 اس وقت کا ذکر ہے جب کہ وہ متعدد معبودوں پر ایمان رکھتے تھے اور توحید میں
 خالص اعتقاد نہ رکھتے تھے —

بات اصل میں یہ تھی کہ "یاہوا" کے عبادت گزار نہ یاہوا کے وجود کے منکر تھے اور نہ اس کے علاوہ دیگر کسی معبود کے وجود کا انکار کرتے تھے، البتہ ان کا یہ وجود دیگر معبودوں پر فضیلت رکھتا تھا، جیسا کہ وہ خود بھی دیگر قبائل کے مقابلہ میں فضیلت و شرف کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

دوسرے معبودان کے خیال میں اسی طرح موجود تھے جس طرح ان کا معبود "یاہوا" موجود تھا لیکن وہ ان کے خیال میں عبادت کے مستحق نہ تھے کیونکہ وہ دشمنوں کے معبود سمجھے جاتے تھے۔ ان معبودوں کی پرستش بنی اسرائیل کے خیال میں ایک بڑی خیریت تھی کفر نہ تھا جیسا کہ بعد میں آنے والے لوگوں نے سمجھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اجنبی معبودوں کی پرستش ایسی ہی قبیح تھی جیسی کہ کسی اجنبی بادشاہ کی وفاداری۔ ایک قسم کی قومی غداری اور خیانت متصور کی جاتی ہے۔

اسی لئے انبیائے تورات یاہوا، یا دیگر معبودوں کو ثابت کرنے میں مصروف نہ رہتے تھے بلکہ ان کا زیادہ تر شغل یہ تھا کہ لوگ یاہوا کی غیرت و ناراضی سے ڈریں۔ اور اس کے انتقام و عذاب سے اپنی قوم کو بچائیں۔ یاہوا کا عذاب اس وقت کہیں زیادہ سخت ہو جاتا تھا جب بنی اسرائیل مصر، بابل یا کنعان کے معبودوں میں سے کسی معبود کی پرستش کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔

مسیحیت کا ظہور ہوا تو اس مذہب اور دیگر اسرائیلی مذاہب میں وجود الہی یا انبیائے تورات کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ زیادہ تر تیسوں اور کاہنوں کا باہمی اختلاف تھا کیونکہ وہ عبادت کے مظاہر اور شعائر مقدسہ میں جکڑ بند کر کے اموال و سلطنت حاصل کرنا چاہتے تھے اور دنیوی منافع کو ایمانی فرائض پر فوقیت دیتے تھے مسیحی مبلغوں کو ربوبیت کے نظریہ میں اخلاص کی اشاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ ان کی تبلیغ کا دائرہ اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں یعنی

رُوم وغیرہ میں وسیع ہوا۔ یہ زمانہ انجیلوں کی کتابت کے کچھ ہی بعد کا زمانہ ہے —
یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل کے صحیفوں میں وجود الہی کے اثبات پر براہین کا
تکرار و اعادہ نہیں ہے۔ چونکہ قرآن کا خطاب منکرین، مشرکین، یہود، عیسائی اور
ربوبیت و عبادت کے بارے میں اختلاف کرنیوالوں سے تھا اور اپنے زمانہ نزول
میں بستے والی تمام اقوام، قبائل عرب اور تمام اُمتوں سے تھا، اسی لئے اُسے اپنے
ہر خطاب میں ربوبیت کا ایک واضح تصور پیش کرنا پڑا۔ اسی کی دعوتِ حکیمانہ فراست
و عقل کے ساتھ عبارت سکھاتی ہے اور ایک معبود اور ان دیگر معبودوں میں تفریق کرتی ہے
جو اس وقت بے دلیل معبود بنے ہوئے تھے —

قرآن نے جن لوگوں کو خطاب کیا ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو وجودِ الہی کا انکار کرتے
تھے اور ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو بت پرستی یا تنویریت کا عقیدہ رکھتے تھے اور آباؤ
اجداد سے وراثت میں یہی عقیدہ انہیں ملا تھا —

کچھ لوگ وحدانیت کے نظریہ میں تنویریت کی آمیزش کرتے تھے اور کتبِ منزلہ
کی تشریحات میں لڑتے جھگڑتے تھے جیسے کہ یہود و مسیحی گروہ —

قرآن، عقل کو خطاب کرتا ہے تاکہ اس کی مخالفت کرنے والوں کو
جس کو انسانی عقلیں قبول کرتی ہیں اطمینان و سکون کی دنیا عطا کرے —

قرآن کریم میں صرف یہی دلائل نہیں بلکہ بہت سی مثالیں موجود ہیں اور مختلف
نوعیت سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان آیات میں بہت اہم دلائل بھی بیان کئے
گئے ہیں بہت سے حکمانے وجودِ الہی کے اثبات پر ان سے کافی فائدہ اُٹھایا ہے، ان
دلائل کے نام یہ ہیں، براہینِ تخلیق و ایجاد، براہینِ قصد و نظام، براہینِ کمال و استعلاء،
اور مثلِ علی — قرآن میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے جو دلائل اُس نے
خاص طور پر بیان کئے اور تاکید و توضیح کے ساتھ انہیں مخصوص کیا، ان میں قناعت بخشنے

والی دلیل اور اندھے مادہ پر کائنات کے وجود کو قائم کرنے والوں کے قول کو پارہ پارہ کر دینے والی پہلی دلیل ظہورِ حیات کی برہان ہے۔ یعنی مادہ میں کس طرح جان پڑی۔ ؟ قرآن کہتا ہے ” اللہ تعالیٰ بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے ... “ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہارے کان آنکھیں اور دل پیدا کئے۔ ... —

دوسری دلیل برہانِ تناسل ہے۔ یعنی بقائے حیات کو دوم بخشنے کے لئے جانداروں میں اُس نے سلسلہٴ تناسل قائم کیا۔ چنانچہ تمہارے ہی نفوس میں تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے۔ —

ظہورِ حیات کے مسئلہ میں مادیین بے بس نظر آتے ہیں۔ بے جان مادہ میں ظہورِ حیات کی وہ کوئی توجیہ نہیں کر سکے، بجز اس کے کہ جو دعویٰ ہے وہی دلیل ہے یا پھر اُنکل سے رجحاً بالغیب بے دلیل باتوں میں مجبوظ الحواس نظر آتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تو ان کا ایمان نہیں۔ غیب کی وہ تصدیق نہیں کرتے اور مشاہدہ یا جو مشاہدہ میں داخل ہے یعنی لمس وغیرہ کے سوا وہ کسی چیز پر اعتماد نہیں کرتے، اس لئے وہ ظہورِ حیات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ —

مادہ میں ظہورِ حیات کی بعض نے یہ تشریح کی ہے کہ مادہ میں باہمی ترکیب و آویزش کے بعد جان پڑنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی تشریح نہیں۔ ... بلکہ ایسا ہے جیسے ایک محسوس واقعہ کی کسی محسوس واقعہ سے تشریح کر دی جائے۔ — بعض عالموں جیسے لارڈ کلفن کی رائے ہے کہ حیات کے جراثیم اس کرۂ ارض پر فضا میں منتشر شہابی شعلوں کی صوت میں منتقل ہو گئے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض بحالہ قائم رہتا ہے کہ ان جراثیم کے کرۂ ارضی کی طرف منتقل ہونے اور ظہورِ حیات کے نوبت آنے کی کیا وجہ تھی، حالانکہ اس بے جان مادہ میں حیات کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ حاصل یہ ہے کہ ظہورِ حیات کے مسئلہ میں دو قولوں میں سے ایک قول اختیار کرنے کے سوا

چارہ نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ خود مادہ میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہے، لہذا کسی پیدا کرنے والے اور صاحب ارادہ کو ماننے ضرورت نہیں۔ اور یا یہ کہا جائے کہ یہ ایک صاحب ارادہ خالق کا فعل ہے جو اپنے ارادوں میں پوری قدرت رکھتا ہے۔ اگر یہ تمام عالم مادہ ہی مادہ ہے اس کے سوا اور کچھ موجود نہیں۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ مادہ ازلی ابدی ہے جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا، وہ ازل سے اپنی کامل قوتوں اور جملہ خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خالص مادہ کو لازم ہیں خواہ مادہ فضا یا ارض میں موجود ہو یا اس کے علاوہ کہیں اور اپنا مقام رکھتا ہو۔

لیکن اس صورت میں اس بات کی توجیہ کرنا ہوگی کہ گروں میں کس گروں میں زندگی ہے اور کس گروے میں نہیں۔ زمانہ کی مسلسل رفتار میں بھی صورت ہے کہ زمانہ کے بعض حصوں میں زندگی تھی اور بعض میں نہیں تھی، جب حیات کی صلاحیتیں مادہ میں موجود تھیں تو وہ حیاتیں کروڑوں سال سے کیوں برائے کار نہیں آئیں بلکہ سالوں کا جواب کروڑوں سے بھی اوپر ہے۔ پھر ایک زمانہ جو چند ہزار سال میں محدود ہے ایسا آتا ہے کہ ایک معینہ تاریخ میں حیات کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مسلسل ازلی نظام میں اس معینہ تاریخ کا کیا جوڑ ہے؟ — سوال یہاں اس اضطراری کیفیت کا ہے جس میں کوئی اختیار موجود نہیں۔ اگر اس مسئلہ کو کسی صاحب اختیار کے ارادہ پر مبنی کیا جائے تو اس کی توجیہ آسان ہو جائے گی، کیونکہ خاص زمان و مکان میں یہ تدبیر و تخلیق ہوئی، کیونکہ تدبیر کا تعلق اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔

مادہ میں اگر ازل سے کچھ خصوصیات پنہاں تھیں تو ان کا عمل کیوں ازل ہی سے جاری نہیں ہوا؟ یہ ترکیبی خصوصیات زمانہ کی کیوں محتاج ہوئیں۔ حالانکہ زمانہ بھی مادہ ہی کی فطرت سے وجود میں آیا ہے۔ جب سے وہ خصوصیات موجود ہیں مادہ کی فطرت بھی انہیں لازم ہے۔ یہ ترکیب کیوں اس معینہ زمانہ کو مقتضی ہوئی۔ اور کیوں مادہ کے

علاوہ کسی جزو میں اور فضا کے کسی محدود مکان کے علاوہ میں یہ ترکیبی تقاضے پورے نہیں ہوئے؛ مسئلہ ہزار سال، دس ہزار سال یا کروڑ، دس کروڑ یا ہزار کروڑ یا کروڑ ہا کروڑ کا نہیں بلکہ "ابد" کا ہے جس میں نہ عالم کی ابتداء ہے نہ انتہا، نہ عقل کے لئے ٹھہرنے کا کوئی مقام، اس غیر محدود زمانہ میں یہ حیاتی خصوصیات کیوں محدود ہوئیں؟ اور کیوں یہ ترکیبی اجزاء زمان و مکان کے محدود حصوں میں تقسیم ہوئے؟ حیات مادہ سے کیوں ایک دم متصادم ہو گئی۔ اس میں جو تمام تدبیری صورتیں ممکن تھیں بے عقل مادہ میں کیسے آگئیں؟ یہ بات عقل کے ذمہ ہے کہ وہ ان ترجیحی اسباب حیات کو خالق و صاحب ارادہ کی صنعت قرار دے۔ لہذا اس آسان سے فرض کے مقابلے میں ایک غیر ممکن فرض کو کیوں ترجیحی دی جائے۔

ہمارا یہ فریضہ نہایت سہل الفہم ہے کہ حیات کا ظہور صاحب ارادہ خالق کی طرف سے ہوا، اس خالق کے تمام یا بعض مقاصد اگر ہمیں معلوم نہ ہوں تو بھی عقل اس خالق کا انکار یا نفی نہیں کرتی، کیونکہ اس قدر جان لینا کافی ہے کہ صاحب ارادہ خالق اپنی غرض بھی جانتا تھا۔ اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ عقل کو بھی اس کا علم ہو اور ہر عقل اس پر خاطر رکھتا ہو۔ یہ ہمارے شعور کے لئے ممکن نہیں کہ بے عقل اندھے مادہ نے خاص زمان و مکان میں ظہور حیات کو ترجیح دی۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شان حیات میں مادہ کے قوانین ازلی دویں کروڑ ہا کروڑ سالوں کے بعد یونہی جاری ہوا کرتے ہیں یا یہ کہنا صاف اور سیدھی بات ہوگی کہ زمان و مکان کی یہ ترجیح ایک صاحب اختیار ارادہ کی جانب سے ہوئی۔ ساتھ ہی وہ جو کچھ اختیار کرتا اور ارادہ کرتا ہے اس کو جانتا بھی ہے مسئلہ کی اس تشریح کے بعد حیات کے ظہور کے لئے زمان و مکان کی ترجیح کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا۔

— لہذا بے جان مادہ میں زندگی کی تخلیق — یا میت سے زندہ کھاج۔

قرآن کریم کی تاکید و توضیح کی روشنی میں ایک معجزہ ہے۔ اور لطیف دلائل کے ساتھ ایک لطیف ذات سے متعلق عقول میں حیرت انگیزی کا موجب ہے، کیونکہ مادہ افلاک، مدار اور برجوں میں منظم ہے، مگر تنظیم مادہ کے حالات میں ایک ایسی حالت ہے جو مادہ کو پیش آتی ہے، عقل کو کسی خارجی قوت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ کہ مادہ نے خود ہی اپنے کان اور دل پیدا کر لئے، کسی طرح بھی عقلاً قابل قبول نہیں جب تک کہ اس کی تشریح نہ کی جائے اور یہ جو کہا گیا کہ زندہ جسم کی ترکیب قابل تعجب نہیں کیونکہ ہم آلات مادہ کو یہ دیکھتے ہیں کہ ایک معلوم مقصد کے لئے خاص نظام و عمل کے لئے حرکت کرتے ہیں، غلط ہے۔ ہمیں انتہائی تعجب زندہ اجسام اور آلات کے درمیان تشابہ ماننے پر ہے کیونکہ آلات صانع کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اگر مادہ کے اعمال کی توجیہ حرارت و حرکت سے کی بھی جائے تو بھی گویا ایک ایسے اجنبی کو ماننا ہوگا جو ان قوانین کو مسخر کرنے والا ہو۔

لوگ ظاہر میں آنکھوں سے زندہ اجسام کے اعضاء کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس پر انتہائی تعجب کرتے ہیں کہ وہ دقیق ہیں باہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ہیں۔ ایک کا عمل دوسرے کے لئے معاون ہے۔ نشو و نما کے عمل کی رفتار عسر اور نوعیت کے مطابق جاری ہے۔ انسان، حیوان، حشرات الارض اور نباتات تمام کے اجسام میں یہی کیفیت ہے۔۔۔۔۔ ان تعجب کرنے والوں کو اس سے کہیں زیادہ تعجب ان اعضاء کی اس ترکیب پر ہونا چاہیے جو انہیں عمل تحلیل اور خوردبینوں سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ یہ وظائف کس طرح باہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ہیں، ان کو معلوم ہوگا کہ آنکھوں سے نظر آنے والے یہ اعضاء ان لاکھوں رات سے مرکب ہیں جو آنکھوں سے دکھائی بھی نہیں دے سکتے۔ ہر ذرہ جسم کے مناسب مقام پر بٹھیرا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اس طرح مدد دے رہا ہے گویا اُسے دوسرے

ذرات کی احتیاج و طلب معلوم ہے۔ ان میں سے اگر ایک ذرہ بھی بیماری کی وجہ سے اپنے عمل سے بھٹکے لگتا ہے تو دوسرے تمام ذرات اس کی غلطی اور تعطل کی اصلاح کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی سالانہ فزیالوجی کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے پروفیسر لیٹھس نے کہا تھا کہ ”پروٹین کا ہر خلیہ سینکڑوں حلقوں کے سلسلہ میں مربوط ہوتا ہے، پھر ان میں سے ہر حلقہ کچھ ایسے ذرات سے مرکب ہے جن کا قوام نوٹا در کی ترشی پر مبنی ہے۔ یہ ترشی ان میں تقریباً بیس فی صد ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے نسبت و ترتیب کے مطابق ان میں ہر ایک کا وقوع نہ ہو لیکن ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ ہر حلقہ کے نظام میں یہی ایک ترتیب و نظام موجود ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی نادر صورت حال موجود نہیں۔“

سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس دقیق نظام میں کوئی غلطی پیش کر سکتے ہیں؟ قوت خیال کی اس دقیق رسی کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ عام انسانی لغت میں ابجدی حروف کو سوچیں کہ یوں تو وہ تیس سے زائد نہیں مگر اپنی متغیر ترکیبوں میں قوموں کے تمام کلمات و عبارات میں بولے جانے والے الفاظ میں وہ بے شمار ہیں۔ اسی طرح پڑھنے کا خلیہ اپنے چھوٹے سے حجم میں ہزاروں خلیوں کو قبول کرتا ہے مگر ہمارا مشاہدہ ایک متغیر ترتیب میں صرف ایک ہی لفظ کا سا ہے۔ اس سے آپ توفیق و ترکیب کی صلاح و برستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس خیال کو لیٹھس نے ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ کہکشاں کی روشنی کو ایک جانب سے دوسری جانب پہنچنے میں تین لاکھ سال لگتے ہیں۔ تو اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خلیہ کی ترکیب کو ٹھیک نشانہ پر بیٹھنے میں ایک قابل فہم مثال سے تشبیہ دیں تو اس کی واضح تصویر یہ ہو سکتی ہے کہ زمین سے ایک گولی چلائی جائے جو کہکشاں کی نہر میں آنکھ کے

ایک معین ستارے کے نشانہ پر جا لگے، اسی طرح یکے بعد دیگرے برابر گولیاں چلیں اور کبھی اس نشانہ سے خطانہ کریں۔ یہ نظریہ بھی اس مفروضہ پر قائم ہے۔

کہ خلیہ کے حلقے صرف پچاس ہیں، سینکڑوں نہیں۔

اگر یہ تمام نظام اتفاقی تصادم ہے اور اس میں خلق و تدبیر نافذ نہیں تو چاہیے کہ عقل کی دشمنی قصد کے معنی صرف غلطی کی طرح بٹا دیئے جائیں۔

اس تمام احاطہ اور تجزیہ سے بھی حیرت و تعجب کے تمام مراحل ہم نے طے نہیں کر لئے، کیونکہ وہ جاندار جسم جس میں یہ معجزات ہر لحظہ مکرر ہوتے ہیں۔ اسی جسم میں اس کے علاوہ اور بہت سی حیرت انگیزیاں موجود ہیں جو شاید ہماری اس دریافت شدہ حیرت و استعجاب سے کہیں زیادہ ہوں۔ غور کیجئے کہ یہ ننھے ذرات جمع بھی ہوتے ہیں اور منتشر بھی یہ ترکیب و انتشار ایسے طریقہ پر ہوتا ہے کہ جو تجدّد اور دوم حیات کا بھی ضامن ہے ہر جاندار دو جنسوں سے مرکب ہوتا ہے۔ ہر ایک میں سے خلیہ نکلتا ہے اور وہ باہم مل کر

ایک نیا جاندار بن جاتا ہے۔ یہ دونوں خلیے کبھی جوڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور کبھی انفرادی طور پر۔ الغرض جس مرحلہ میں جیسا مقام مناسب ہوتا ہے منقسم ہو جاتے ہیں۔ جانداروں کی ہر نوع میں بغیر زیادتی و نقصان کے ان خلیوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ ہر جاندار اپنی مخصوص عادتیں لے کر پیدا ہوتا ہے جو ایک مقررہ وقت پر اس کو تناسل کی طرف لاتی ہیں۔ پرندوں میں وقت سے بہت پہلے ہی گھونسلہ تیار کیا جاتا ہے سمندری مچھلیاں اپنی نسل و ولادت سے پہلے شور پانی سے نکل کر نہروں اور خلیجوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ولادت سے پیشتر ہر جوڑا ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بیقرار نظر آتا

ہے۔ ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگر یہ تمام ناکہانی اتفاقات پر مبنی ہے اور اگر خلق و تدبیر کے مقابلہ میں یہی رائے زیادہ صحیح ہے تو انسانی عقل میں قصد کے معنی بالکل غلط ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں کہیں بھی خالق و کریم کے وجود کے اثبات میں برہان حیات اور برہان نسل پیش کی ہے۔ زندگی رکھنے والوں کو زندگی کی لغت سے خطاب کیا ہے اور عقلمندوں کو عقل کی لغت سے خطاب کیا ہے جس برہان کے ذریعہ قرآن اس کی وحدت ثابت کرتا ہے اس کے مدبر و حکیم ہونے کے اثبات پر بھی اسی برہان حیات یا برہان نسل کے ذریعہ استدلال کرتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے —

”اگر آسمان و زمین خدا کے علاوہ اور بھی کچھ معبود ہوتے تو یہ زمین و آسمان تباہ ہو جاتے۔ وحدانیت کے اثبات میں اس سے مضبوط دلیل پیش نہیں کی جا سکتی، مشکمین اسلام اور توحید پر بحث کرنے والے اس کو برہان تمانع کہتے ہیں۔ اہم رازی نے لکھا ہے کہ تعدد آلہ کی صورت میں فساد ممکن ہے۔ لہذا اللہ نے اس ممکن کو ظاہری بناء پر واقعہ کی صورت میں بیان کر دیا ہے —

امام نور الدین صابونی سے صاحب سفینۃ الراغب نقل کرتے ہیں: تعدد آلہ کی مثال میں اگر ان دو معبودوں میں موافقت و مصالحت ہوگی تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ضروری اور جبری ہوگی، اس صورت میں وہ دونوں عاجز و مضطر ٹھہرے۔ یا اختیاری ہوگی مگر دونوں میں اختلاف ہو جانا بھی ممکن ہوگا تو اس صورت میں دلیل کا مدعی حاصل یعنی ایک اور دوسرا مغلوب ہوگا۔“

شرح نلّا جلال دوانی نے خوب لکھا ہے کہ ”اس صورت میں نظام عالم کے لئے یا تو ان متعدد خداؤں کی قدرت اور ارادہ کافی ہوگا یا کافی نہ ہوگا۔ یا اس کیلئے صرف ایک ہی کافی ہوگا۔ پہلی صورت میں دو مکمل متضادوں کا ایک محلول پر اجتماع لازم آتا ہے جو محال ہے۔ دوسری صورت میں دونوں خدا عاجز ہوئے کیونکہ ان کی قدرت اسی وقت نافذ ہو سکتی ہے جب کہ دونوں شریک ہوں۔ تیسری صورت میں جب کہ ایک کافی ہے تو دوسرا خالق نہ ہوا، لہذا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا“ (اللہ — از عباس محمود) —

معرفتِ الہیہ کے

شرآنی دلائل !

امام رازیؒ فرماتے ہیں:۔

خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے وجود کے دلائل قائم کئے ہیں ان میں چند باتوں کا لحاظ رکھا ہے۔

۱۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید چونکہ خاص و عام دونوں کیلئے نازل کیا گیا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے وجود پر جو دلائل قائم کئے ہیں وہ بہت زیادہ پیچیدہ نہیں ہیں بلکہ قریب الفہم اور دلنشین ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ قرآنی دلائل کا مقصود بحث و مناظرہ نہیں بلکہ عقائدِ حقہ کا اثبات ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے اپنے ثبوت کے دلائل کو دلائلِ نفس اور دلائلِ آفاق میں محدود کر دیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے دلائل سے بندوں پر خدا کے احسانات کا اظہار ہوتا ہے جس سے بندے کے دل میں خداوند تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اور وہ بحث و نزاع کو چھوڑ کر خدا کی اطاعت و انقیاد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

انہی دونوں اصول کے مطابق خداوند تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں اپنے وجود پر یہ دلیل قائم کی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ
الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي
جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا
وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ

بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا
لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا
وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ —

(بقرہ - ۳)

لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت
کو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو
تم سے پہلے ہو گزرے ہیں پیدا کیا،
عجب نہیں تم (آخر کار) عذاب سے
بچ جاؤ جس نے تمہارے لئے زمین
کا فرش بنایا اور آسمان کی چھت اور
آسمان سے پانی برسا کر اس سے
تمہارے کھانے کے پھل پیدا کئے
پس! کسی کو اللہ کا ہم پلہ نہ بناؤ
حالانکہ تم تو جانتے اور بوجھتے

ہو

اور اس دلیل کے متعلق امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ثبوت کے متعدد
طریقے ہیں لیکن حدوثِ اعراض سے استدلال کرنے کا طریقہ سب سے زیادہ قریب الفہم
ہے اور یہ طریقہ دلائلِ نفس اور دلائلِ آفاق میں محدود ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں دلیلوں کو جمع کر دیا ہے۔ دلیلِ نفس
یہ ہے کہ ہر شخص بدلتا جاتا ہے کہ وہ اس پہلے موجود نہ تھا اور اب موجود ہوا ہے لیکن جو چیز
عدم کے بعد موجود ہوتی ہے اس کا کوئی موجد ہوتا ہے۔ لیکن اپنا موجد نہ وہ خود شخص ہے نہ
اس کے باپ ماں ہیں نہ اور لوگ ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی ترکیب سے اور لوگوں کا بحرِ بدلتہ
معلوم ہے، اس لئے ایک ایسے موجد کی ضرورت ہے جو ان موجودات سے مختلف ہوتا
ہے کہ وہ ان اشخاص کی ایجاد کر سکے، البتہ اس موقع پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ
فصول کی طبعیتیں، آسمان اور ستارے اس قسم کا اثر کیوں نہیں پیدا کر سکتے؟ چونکہ یہ

یہ اعتراض ہو سکتا تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کے بعد یہ بیان کیا کہ یہ چیزیں بھی خود ایک موجد کی محتاج ہیں۔ یعنی یہ کہ اس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا، اور آسمان کی چھت بنائی اور اسی کا نام دلائل آفاق ہے۔ اور اس میں دنیا کے تمام تغیرات مثلاً رعد، بجلی، ہوا، بادل، فصلوں کا اختلاف سب شامل ہے۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اجسام فلکیہ اور عنصریہ سب کے سب جسمانیات میں مشترک ہیں، اس لئے ان کے مخصوص اوصاف مثلاً ان کی مقدار اور شکل جسمانیات یا جسمانیات کے لوازم کے نتیجہ نہیں ہو سکتے، ورنہ سب میں یہ اوصاف مشترک ہو جائیں گے، اس لئے ان کا مخصوص ان سب کے الگ ہونا چاہیے لیکن اگر وہ بھی جسم نہ ہو تو یا موجب بالذات ہو گا یا مختار، پہلی صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں بعض اجسام کا بعض اوصاف کے ساتھ کے متصف ہونا، دوسرے اجسام سے اولیٰ نہ ہو گا، اس لئے اس کو قادر مختار ہونا چاہیے، اس سے ثابت ہوا کہ تمام اجسام ایک ایسے موثر قادر کے محتاج ہیں جو نہ جسم ہے نہ جہانی ہے۔

ان سب کے بعد اہم رازی نے زمین اور آسمان وغیرہ کے فوائد بتائے ہیں تاکہ ان سے خداوند تعالیٰ کے احسانات کا ظہور ہو اور بندے کا دل اس کی محبت سے معمور ہو جائے خدا کے وجود اور قدرت و حکمت کے متعلق قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے: —

هو الذی یوکی البرق	وہی (قادر مطلق) جو ڈرانے اور
خوفاً وطمعاً وینشئ	رتز بارش کی) امید دلانے کے لئے
السحاب	(بجلی کی چمک) تم لوگوں کو دکھاتا
الثقال	اور پانی سے بھرے ہوئے) بوجھل
(القرآن) (رعد-۳)	بادلوں کو ابھارتا ہے۔

لیکن یہ دلیل بھی محض خشک فلسفیانہ دلیل نہیں ہے بلکہ رُوحِ قرآنی کے بالکل مطابق ہے چنانچہ اہم رازی اس کے متعلق لکھتے ہیں: —

وانھا تشبہا النعم	اور یہ دلیل بعض وجوہ سے نعمت اور
والاحسان من بعض	احسان سے اور بعض وجوہ سے عذاب
الوجوہ وتشبہ العذاب	قہر سے مشابہت رکھتی ہے۔
والقمر۔	

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ بجلی خدا کی قدرت کی نہایت عجیب دلیل ہے کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بادل، پانی کے مرطوب اور ہوا اور آگ کے اجزا اسے مرکب ہے لیکن پانی کے اجزا اس میں غالب ہیں اور پانی مرطوب اور سرد اور آگ گرم اور خشک ہے اور ضد کا ضد تام سے ظاہر ہونا عقل کے خلاف ہے۔ اس لئے ایک ایسے صالح مختار کا وجود ضروری ہے جو ضد کو ضد سے پیدا کر کے —

اس طرح بادلوں کا پیدا کرنا بھی خدا کی قدرت اور حکمت کی دلیل ہے کیونکہ پانی کے اجزا یا تو فضا میں پیدا ہوئے ہیں یا یہ کہ وہ زمین سے چڑھ کر اُپر گئے ہیں۔ پہلی صورت میں وہ ایک حکیم قادر کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہی مقصود ہے لیکن دوسری صورت میں وہ اجزا زمین سے چڑھ کر ہوا کے سرد طبقے میں پہنچے ہیں اور سرد ہو کر بھل ہو گئے ہیں، پھر زمین کی طرف واپس آئے ہیں

بارش کی صورت مختلف ہوتی ہے، کبھی بوندیں بڑی ہوتی ہیں، کبھی چھوٹی، کبھی قریب گرکتی ہیں، کبھی دُور دُور۔ کبھی دیر تک بارش ہوتی ہے کبھی کم، اس لئے باوجودیکہ زمین کی طبیعت ایک اور بُخارات پیدا کرنے والے سورج کی طبیعت ایک ہے۔ بارش کے اوصاف کا یہ اختلاف کسی فاعل مختار کی تخصیص ہی سے ہوگا —

تحفہ حیدر باری

حکماء و متکلمین دونوں اس پر متفق ہیں کہ واجب الوجود یعنی خدا صرف ایک ہے۔ لیکن دلائل دونوں کے مختلف ہیں، حکماء فلاسفہ نے اس پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کو امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں بیان کیا ہے۔ ان میں پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر دو چیزیں وجوب وجود میں شریک اور ماہیت و تعین میں مختلف ہوں تو ہر ایک کا وجوب وجود ہر ایک کے تشخص تعین سے مختلف ہوگا۔ اب صرف دو صورتیں ہوں گی —

۱۔ ایک تو یہ کہ ان میں ہر ایک کے وجوب، وجود اور تعین میں تلازم ہوگا۔

۲۔ یا یہ کہ دونوں میں تلازم نہ ہوگا —

اگر دونوں میں تلازم نہیں ہے تو بذات خود وجوب وجود اس تعین کو نہ چاہے گا اسی طرح وہ تعین بھی وجوب وجود کو نہ چاہے گا۔ اس بنا پر اس وجوب وجود کو اس تعین کے ساتھ وجوب وجود کے ساتھ مستصف کرنے کے لئے ایک سبب خارجی کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ ممکن الوجود اور اپنی ایجاد و تعین میں دوسرے کی محتاج ہو جائیں گی، پہلی صورت میں یعنی جب وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہو تو یہ تلازم یا تو وجوب وجود اور تعین کی نفس حقیقت کا نتیجہ نہ ہوگا یا یہ کہ ان کی

نفس حقیقت کا نتیجہ ہوگا اگر ان کی نفس حقیقت کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا کوئی خارجی سبب ہوگا اور جو چیز خارجی سبب کی محتاج ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود قرار دیا گیا ہے وہ ممکن ہو جائیں گی اور اگر یہ تلازم دونوں کی نفس حقیقت کا اقتضا ہو تو لازمی طور پر ایک دوسرے کی علت ہوگا اور دوسرا اس کا معلول ہوگا۔ کیونکہ اگر ہر ایک دوسرے کی علت ہو تو اس سے دور لازم آئے گا، لیکن تعین وجوب وجود کی علت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں اگرچہ وجوب وجود اس ذات خاص میں داخل ہے تاہم وہ اس تعین سے خارج ہے، کیونکہ وجوب وجود ان دونوں خدا میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے اور وہ دونوں کو ایک دوسرے سے امتیاز صرف تعین سے ہوتی ہے۔ اور ماہ بالاشتراك بالامتیاز سے الگ ہوتا ہے، اس بنا پر وجوب بالذات دوسری ماہیت کا تابع ہے — اور یہ محال ہے، اب لامحالہ ماننا پڑے گا کہ وجوب بالذات اس تعین کی علت ہے، اس لئے جہاں وجوب بالذات پایا جائے گا اس کا معلول یعنی یہ تعین بھی پایا جائے گا، اس لئے ہر واجب الوجود صرف ایک ہی ہوگا — اس سے ثابت ہوا کہ واجب الوجود صرف ایک ہے —

مشکلمین نے خداوند تعالیٰ نے خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر جو دلیل قائم کی ہے۔ اس کی بنیاد قرآن مجید کی اس آیت پر ہے: —

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ	اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا
إِلَٰهٌ لَّكَفَسَدَتَا۔	اور خدا ہوتے تو لازماً زمین و آسمان

(انبیاء) — برباد ہو جاتے —

اگر اس دلیل کو خطابی دلیل مان لیا جائے تو اس کے لئے کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں، فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ: —

”دو بادشاہ در ایامے ننگیند“

اس لئے اگر آسمان و زمین میں متعدد خدا ہوتے تو ان میں جیسا کہ دنیوی بادشاہوں میں ہو کر رہے باہم اختلاف ہوتا اور اختلاف کے بعد جنگ و جہل کی نوبت پہنچتی اور دنیا کا یہ نظم و نسق قائم نہ رہتا۔

قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: —
 وَمَا كَانَ مَعَهُ
 إِلَهٌ إِذَا الذَّهَبُ كُلُّهُ
 إِلَهُهُ بِمَا خُلِقَ وَلَعَلَّ
 بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ
 (مومنون) —

اور نہ اس کے ساتھ کوئی خدا ہے
 ورنہ ہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو
 الگ الگ لئے پھرتا اور (آپس میں
 لڑتے اور آخر کار) ایک دوسرے
 پر غالب آجاتا —

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ إِلَهَةٌ
 كَمَا يَقُولُونَ إِذْ الْأَوَّلُونَ
 يَتَخَوُّونَ إِلَهَ الْعَرْشِ
 سَبِيلًا
 (بنی اسرائیل)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو) اگر
 اگر خدا کے ساتھ جیسا کہ یہ لوگ کہتے
 ہیں (اور) معبود (بھی) ہوتے تو اس
 صورت میں ان معبودوں نے (کبھی کا)
 مالک عرش (یعنی خدا) تک پہنچنے
 کا راستہ ڈھونڈ لیا ہوتا۔

لیکن اہم رازی صاحب نے تفسیر کبیر اور علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کو بڑبانی
 قرار دیا ہے اور اس کی جو تقریر کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو خدا کا وجود فرض کیا جائے
 تو ہر ایک تمام مقدورات پر قادر ہوگا۔ اس لئے ہر ایک زید میں حرکت اور سکون پیدا کر
 سکے گا، اب اگر ایک نے زید میں حرکت اور دوسرے نے سکون پیدا کرنا چاہا اور

دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ضدین یعنی حرکت و سکون کا اجتماع لازم آئے گا۔ اور یہ محال ہے اور اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ بھی محال ہے، کیونکہ ہر ایک کی ارادہ کی کامیابی میں دوسرے کا ارادہ باہم متضاد ہونے کی وجہ سے مانع ہے۔ اس لئے ایک اپنے ارادہ میں اس وقت ناکامیاب ہوگا جب دوسرا اپنے ارادہ میں کامیاب ہو۔ اسی طرح جب دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب ہوگا تو پہلا کامیاب ہوگا اس لئے اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہیں تو دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب بھی ہوں گے اور یہ محال ہے۔

اور اگر صرف ایک کا مقصد حاصل ہو اور دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ صورت بھی محال ہے۔ کیونکہ اولاً تو دونوں خدا یکساں طور پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک کی قدرت کو دوسرے کی قدرت پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جو خدا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہا وہ عاجز ہوگا اور خدا کی ذات میں عجز ایک غیب ہے۔ لیکن اس دلیل کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان دونوں معبودوں میں اختلاف کا ہونا لازمی اور قطعی ہو۔ حالانکہ وہ قطعی و لازمی نہیں بلکہ ممکن ہے، اس لئے دو معبودوں کی موجودگی میں نظام عالم کی اتبری ممکن ہوگی لازمی نہ ہوگی، حالانکہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لازمی اور قطعی ہے۔

امام رازی نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے اس دلیل کی ایک دوسری تقریر کی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک چیز کی دو علت تامة نہیں ہو سکتی، کیونکہ علت کی موجودگی میں معلول کا وجود ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے اگر زید کا خالق ایک خدا ہے تو اس کے وجود کے ساتھ زید کا وجود ضروری ہو جائے اور اس کو دوسرے خدا کی ضرورت نہ ہوگی لیکن چونکہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ زید کو دونوں خدا نے مل کر پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے خدا کا بھی محتاج ہوگا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہر ایک خدا سے بے نیاز

بھی ہو گا اور ہر ایک خدا کا محتاج بھی ہو گا۔ اور یہ محال ہے لیکن اس دلیل پر یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ یہ صرف اُس صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے جب ان میں ہر ایک خدا چاہے کہ ایک چیز مثلاً زید کو صرف وہی پیدا کرے اور یہ استبداد و اختلاف کی صورت ہے، لیکن یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ہر ایک دوسرے خدا کی مخلوقات میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا ارادہ نہ کرے، مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے، ایک آسمان کو، ایک حیوانات کو پیدا کرے، ایک نباتات کو — اسی طرح تقسیم عمل کے اصول پر دونوں دُنیا کے کاروبار کو چلائیں اور نظامِ عالم میں نہ کوئی خلل ہو اور نہ ایک معلول کے لئے علتوں کی ضرورت ہو۔

امام رازی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے کہ ایجاد کے معنی اگر نفسِ قدرت و ارادہ کے ہیں تو اس سے موجد میں اشتراک پیدا ہو جائے گا کیونکہ دونوں یکساں طور پر قدرت و ارادہ رکھتے ہیں — اور اگر ایجاد کے معنی خود مخلوق مثلاً زید کے ہیں تو جبکہ دونوں معبودوں کو یکساں طور پر قدرت و ارادہ حاصل ہے تو اس ترجیح کی کیا وجہ ہے کہ وہ مخلوق صرف ایک کی قدرت و ارادہ سے پیدا ہو اور دوسرے کی قدرت و ارادہ سے پیدا نہ ہو، اور اگر ایجاد کے معنی کسی اور چیز کے ہیں تو وہ چیز یا قدیم ہوگی یا حادث، اگر قدیم ہے تو اس کے ساتھ ارادہ کا تعلق ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر حادث ہے تو یہ وہی دوسری صورت ہے —

امام غزالی نے اس مسئلہ کو امام صاحب سے زیادہ صاف اور واضح پیرائے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”دو خالق کے درمیان مخلوقات کی تقسیم کی صرف دو صورتیں ہیں۔ (۱) ایک تو یہ ہے کہ بعض ہواہر و اعراض کو ایک خدا پیدا کرے اور بعض کو دوسرا، مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے اور دوسرا آسمان کو —

(۲) تمام ہواہر کو ایک خدا پیدا کرے اور تمام اعراض کو دوسرا — پہلی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے وہ زمین

کے پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر وہ قادر ہے تو دونوں کی قدرت میں کوئی امتیاز نہیں، اس لئے ان کے مقدور میں بھی کوئی امتیاز نہ ہوگا، اسی لئے جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے، وہ زمین کو بھی پیدا کر سکے گا اور ایک کی ایجاد کو دوسرے کی ایجاد پر کوئی ترجیح حاصل نہ ہو، لیکن اگر وہ زمین کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو یہ محال ہے کیونکہ تمام جواہر متماثل ہیں یعنی ان کی حقیقت ایک ہے اور ایک خاص چیز میں ان کا واقع ہونا بھی متماثل ہے اور جو خدا ایک چیز پر قادر ہے وہ اس کے مثل پر بھی قادر ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی قدرت قدیم ہے اور اس کا تعلق متعدد اجسام و جواہر سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ صرف ایک ہی جسم اور جوہر تک محدود نہیں ہے اور جب قدرت حادثہ کے برخلاف اس کا تعلق متعدد و مقدور سے ہو سکتا ہے تو بعض مقدور کو دوسرے مقدور پر ترجیح کی کیا وجہ بلکہ جب کہ اس کے مقدرات غیر متناہی ہیں تو ہر ممکن الوجود جوہر اس کی قدرت کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت میں جبکہ ایک جوہر اور دوسرا عرض کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو چونکہ یہ دونوں چیزیں مختلف الما ہیتہ ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس خدا کو جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت حاصل ہو وہ عرض کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہو لیکن عرض جوہر کا اور جوہر عرض کا محتاج ہے، اس لئے ہر خدا کا فعل دوسرے کے فعل پر موقوف ہوگا اس صورت میں وہ اس کو پیدا نہ کر سکے گا، مثلاً ایک خدا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس صورت میں جو خدا عرض کو پیدا کر سکتا ہے، وہ عاجز ہو جائیگا، اور عجز قدرت کے منافی ہے۔ یہی حالت جوہر کی بھی ہے کہ جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جوہر کو پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن عرض کا پیدا کرنے والا اس کی مخالفت کرتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں باہم اتفاق ہو یعنی جب ایک خدا جوہر کو پیدا کرے

تو دوسرا عرض کے پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائے، یا دوسرا خدا جب عرض کو پیدا کرنا چاہے تو دوسرا جوہر کو پیدا کر دے، لیکن اگر یہ اتفاق واجب یعنی لازمی اور ضروری ہے تو یہ قدرت کے منافی ہے کیونکہ اس صورت میں جب ایک خدا جوہر اور دوسرا عرض کو پیدا کرے گا تو ہر ایک عرض اور جوہر کے پیدا کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور مجبوری قدرت کے منافی ہے،

اور اگر ممکن ہے یعنی اس قسم کا اتفاق ضروری اور لازمی نہیں ہے تو کوئی جوہر یا عرض پیدا ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک خدا جب جوہر یا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو دوسرا عرض یا جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اور کوئی جوہر یا عرض بغیر عرض اور جوہر کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

البتہ انہوں نے اس دلیل کی جو دوسری تقریر کی ہے اس پر ان کو کامل اعتماد ہے، اور اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

تم کو جاننا چاہیے کہ جب تم اس
دلالت کی حقیقت سے واقف
ہو گئے تو تم کو معلوم ہو گیا کہ اس
عالم علوی و سفلی میں جس قدر مخلوقات
اور محدثات ہیں وہ خدا کی واحد
کی دلیل ہیں بلکہ ہر ایک جوہر اور
عرض کا وجود اس طریقہ کے مطابق
جس کو ہم نے بیان کیا، توحید کی
دلیل تمام ہے، اور اس دلیل کو
خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب کے

واعلوانک لما وقفت
على حقيقة هذه الد
لاله عرفت ان جميع
ما في هذا العالم
العلوي والسفلي من
المحدثات والمخلوقات
فهو دليل على وحدانية
الله تعالى بل وجود كل
واحد من الجواهر
والاعراض دليل تام

متعدد مواقع میں بیان کیا ہے۔ (امام رازیؒ از عبدالسلام ندوی)	على التوحيد من الوجه الذى بيناه وهذا الدلالة قد ذكرها الله تعالى فى مواضع من كتابه
--	---

اس عاجز ابو الخیر کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے۔ اگر کائنات میں دو خدا ہوں تو دونوں میں الوہیت مابہ الاشتراک پائی جائے گی، یعنی دونوں الوہیت کی وصف میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اب دونوں میں وہ کونسا مابہ الامتیاز وصف ہے۔ جو ایک خدا اس دوسرے خدا سے ممتاز ہو سکے، جب تک ان میں کوئی امتیازی صفت نہ پائی جائے، ان دونوں کا دو خدا ہونا ثابت نہیں ہوتا جب ان میں کوئی امتیازی صفت پائی جائے گی جب تفاوت کی وجہ سے ایک خدا ناقص ثابت ہو جائے گا۔ مثلاً ایک خدا دوسرے خدا سے اس لئے ممتاز ہے۔ ایک جوہر پیدا کر سکتا ہے اور دوسرا عرض۔ اب ظاہر ہے جو خدا جوہر پیدا کرنے میں دوسرے خدا سے ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ جب عرض پیدا نہیں کر سکتا۔ تو یہ خدا لازماً اس دوسرے خدا سے ناقص ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کائنات میں صرف ایک خدا ہی ہو سکتا ہے —

قوانین فطرت میں

تغییر کا امکانات

اس میں شک نہیں پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ کائنات کا ہر ذرہ قانون قدرت کا پابند ہے اور وہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے اور عقل و ہمت بہترین دوست۔۔۔ (عجائبات حیات از ہیگل)

لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد کونٹنٹ نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ و مدعیانہ نعروں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ فلسفہ میں تو علت و معلول کے لزوم و وجوب کی بنیادوں کو ہیوم نے کھوکھلا کر دیا تھا، البتہ سائنس کی بنیاد ہی فطرت کی یکسانی یا علیت کے اٹل قانون پر رکھی جاتی تھی۔

اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ خود سائنسی تجربات و اخبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح اور متزلزل ہو گیا ہے بلکہ سر آرٹھر ایڈنگٹن جیسے اکابر سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا پڑا ہے۔ چند سال قبل دُنیا نے سائنس کے تازہ ترین معلومات و خیالات پر "ماڈرن بلیف" کے نام سے مقالوں کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا۔

اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں :-

"کونٹنٹ نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مادی

دُنیا میں اب تک علل و معلول کے قانون کی فرمانروائی کو اُل تصور کیا جاتا تھا، سارے طبعی واقعات و حوادث بالکل جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کئے جاتے تھے، سلسلہ علل و معلولات میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہ تھا مگر سائنس میں اس خیال و یقین کو سخت دھکا لگا اور ماہرین طبیعیات نے دیکھا کہ علیرت کے جو ب و کلیت کو مادی دُنیا سے رخصت کرنا پڑا اور سارے قوانین اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی و قطعی علیرت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔

ابھی بالکل حال تک قانون علیرت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا کارخانہ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے جس کو علّت کہا جاتا ہے؟ یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادث فطرت کی تہہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیاری یا آزادی ارادہ کہا جاتا ہے۔ ماہرین یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی شہادت نہیں ملتی۔“ (بحوالہ جرنل آف فلاسفی سلسلہ ۳)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانین فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں بلکہ ”ان“ کی حیثیت اعداد و شمار کے لئے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتیں ہیں کہ فلاں شخص چالیس سال کی عمر میں مر جائے گا۔ لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فی صد آدمی چالیس کے سن میں مر جائیں گے یعنی افراد کامل ناقابل پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے پس قوانین فطرت صرف اسی معنی میں موجود ہیں۔ (ماڈرن ہیلیف)

بالفاظ دیگر قانون فطرت کی نوعیت دراصل قانونِ عادت کی ہے یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوہاً پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ فلاں عمر میں مرجائے گا، البتہ عاداتاً یہ معلوم ہے کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فی صد چالیس سال کی عمر میں مرجائیں گے۔ مذہب کی زبان میں اسی قانونِ عادت کو عاداتہ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بناء پر بھی عملِ فطرت کی یکسانی یا قوانینِ فطرت کے نفس و جود کا انکار نہیں لازم آتا۔ البتہ ان قوانین کا منشاء یہ ہے بہرے بے علم و اختیار مادہ کا اٹل و جوب و لزوم سے نہیں، بلکہ ایک علمِ اختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادتِ جاریہ سے ہے جو کسی حکمت و مشیت کے تحت کبھی کبھی اس عادتِ جاریہ کے خلاف بھی کر سکتی اور کرتی ہے۔ یہی معجزہ ہے اور بقول مشہور سائنسدان ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائلِ مذہب سائنسدان کو اس کے ملنے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آسکتی۔ کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ ہم کو معجزات کے خلاف اگر سائنس کے کسی ایسے فتویٰ کا علم نہیں جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول سے مانع ہو۔ (ماڈرن بیلٹ)

جب کارپنٹر کے زمانہ ہی میں سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا تو اب کوائنٹم نظریہ کے بعد جب کہ کلام و فلسفہ کے زمرے قیاسات سے گزر کر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا علیت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہو گیا ہے کہ مادی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنا پڑ رہا ہے۔

کیا خالقِ فطرت کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف کر سکتا ہے

بلکہ ایک نامور عالمِ طبیعیات پروفیسر ڈالبیر کا اعتراف یہ ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض طبعی حوادث

اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل و اسباب غائب ہوتے ہیں، اجسام حرکت کرتے ہیں۔ درال حالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھو رہا ہے اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتہ ہے۔ اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں (بلا کسی واسطے) پہنچ جاسکتا ہے اور بس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب غیر غلب نہیں رہا ہے ————— (کتاب مادہ و حرکت از ڈالبیر)

نفس خارق فطرت واقعات کے لئے ہیوم کے نزدیک انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے کہ جس کی بناء پر ان کو قبول کیا جاسکتا ہے —

” فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے لے کر آٹھ دن تک برابر تمام روئے زمین پر تاریکی چھائی رہی۔ یہ بھی فرض کرو کہ اس خارق عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم و کاست بلاشبہ تناقص وہاں کے لوگوں کی یہی روایت بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانے کے حکماء کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کر کے اس کی توجیہ اور اس کے علل و اسباب کی جستجو ہوگی۔

کائنات فطرت میں انحطاط، فنا و فساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابل قبول ہوگی، بشرطیکہ یہ نہایت وسیع ہوتا اور متفق علیہ ہو ————— (فہم انسانی - از ہیوم) —

خالق فطرت، فوق الفطرت امور میں دخل دے سکتا ہے۔

کوئی شخص سرے سے ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو

ظاہر ہے کہ اس کے لئے معجزہ تصدیق نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت۔ کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے اور وہ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے۔ جو آدمی نقطہ، خط، یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس کا ہی قائل نہیں اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو۔ جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح تفصیلات مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔ اسٹورٹ بل نے ہیوم کے انکار معجزات کی تفسیح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

”جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے اس کے سامنے اگر انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارق عادت باتوں کی روایت کی جائے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا، معجزات سے خود خدا کا وجود نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ اس لئے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے موجود نہ ہو تو کسی فوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجزہ نما واقعات کی اور بھی توجہیات ممکن ہیں، یہاں تک تو ہیوم کی دلیل با معنی گہی جاسکتی ہے لیکن اگر ایک ایسی ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر بھی مان لیا جائے تو جو موجودہ نظام فطرت کی خالق ہے اور اس لئے اس میں تغیر و ترمیم بھی کر سکتی ہے تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شے کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا اس پر اس ارادہ کا براہ راست عمل و اثر خواہ مخواہ کا فرض نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ ”امکان“ بن جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور خدا کی مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر ٹھہرتا ہے کہ کائنات

فطرت میں اس کا طریق عمل کیا رہا ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیے۔

(مذہب پر تین مضامین از نل)

معجزہ خلاف فطرت نہیں

اسٹورٹ بل نے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے وہ یہ کہ خدا کو مان لینے کے بعد معجزہ کو قانون فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جاسکتا۔ پتھر کو اوپر پھینکو اور کوئی شے بیچ میں مانع اور عائق نہ ہو تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ کرنا یا ہوا میں معلق رہنا بے شک خلاف فطرت ہوگا۔ لیکن اگر اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ کرنا بالکل خارق عادت نہ ہوگا کیونکہ مانع موجود ہے۔ معجزہ کی صورت میں جو ارادہ خداوندی معمولی سلسلہ علل و اسباب کا خالق ہے وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے۔ لہذا معجزہ نہ خلاف فطرت ہے اور نہ بلا علت کیونکہ عمل علت کی شرط تو یہ ہے کہ مائی مانع نہ موجود ہو اور یہاں موجود ہے۔ — (مذہب پر تین مضامین - از نل)

مادہ کی ازلیست اور اسائن سٹائن کا نظریہ اضافیت

نئی بات جو سائنس اور سائنس دانوں کے نام سے معروف ذہنوں اور عقلوں کے لئے خصوصاً لائق توجہ ہے یہ ہے کہ مادہ کی بظاہر جس کھوس چٹان پر مادیت یا طبعی عوادل و قوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی وہ خود نئی طبیعیات میں برف کی طرح پگھل رہی ہے اب ازلی و غیر فانی مادہ اور کھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں۔ قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا۔ وہ اب عملاً برقی توانائی یا برقیات میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، کوئی نہیں جانتا، یہی نہیں بلکہ مادہ کو کسی معنی میں بھی موجود جاننے کے لئے عام انسانی ذہن و دماغ کیلئے

کم از کم اتنا سہارا ناگزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے لیکن نظریہ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا۔

”مادہ جو ہماری عام فہم و عقل کے لئے ایک موجود فی المكان اور قائم فی الزمان جو ہر تھا اور کائنات نام تھا مادہ کے ڈھیروں ڈلوں یا ایسے مادی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان و مکان میں ادھر سے ادھر مالے مالے پھرتے تھے اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطہ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادہ اور زمان و مکان سرے سے تین جداگانہ حقائق ہی نہیں قرار دیئے جاتے۔“

(ماڈرن بلیف ص ۱۵۱)

ایک عام آدمی عریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادہ نہ کسی جگہ ہے نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی زبان میں تو پھر ہے ”کے کیا معنی؟“ اضافیت کے اس شاہکار کو پوری طرح سمجھنا یا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے۔ عام غامیوں کو سچ پوچھیے تو ایسے مادہ کی نسبت جو زمان و مکان سے اگر مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان و مکان کے منطوق کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ ”ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے۔ اور یہ تو بہر حال واضح ہو گیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جاسکتا۔“ پُرانی مادیت دیوالیہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ مادیت جو کائنات زندگی اور ذہن سب کا محض ایک مادی تصور رکھتی تھی۔ اسی طرح سائنس و ریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصور ہی جھانکنے لگی ہے۔ حتیٰ کہ :

”سائنس دانوں کو طبعی کائنات میں کسی ایسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی تو وہ کوئی ایسی

نہایت ہی عجیب و غریب بنے ہو گی جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھی۔
 ایڈنگٹن نے نظریہ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبیعت
 کی ایک دوسری جدید ترقی کو انہم تھیویری تک پہنچ کر ہم نے خارجی حقیقت
 کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل
 کرنا پڑی ہے جو ملاحظہ ذہنی (SUBJECTIVE) ہیں، اگر خارجی دنیا
 کو جاننے میں ہمارے لئے خود اپنے ذہنی عنصر کو بڑا کرنا مشکل ہے تو خود ان
 (SELF KNOWING) شعور کے مسئلہ میں جہاں ذہن خارج یعنی
 جاننے والا اور جانا گیا حقیقتہً ایک ہو جاتے ہیں اس کو جدا یا ممتاز کرنا نہیں
 زیادہ مشکل ہوگا ————— (ماڈرن بلیٹ)

معرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رخ جس طرح تصویریت یعنی اس خیال کی طرف
 جارہا ہے کہ ہماری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکائیکی کارستانیوں نہیں بلکہ
 ذہن و شعور کی کارفرمائیاں ہیں۔ اور کچھ سائنس دان نہ ہی لیکن سائنس دان فلسفی کی حیثیت سے
 نسیمس، جیاس، ماکس، پلانک، شرودونگر اور آئن سٹائن وغیرہ جیسے رجال سائنس کا
 تصویریت کی جانب رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے
 لگے ہیں۔ جیسا کہ نسیمس جینر کا صاف اعتراف ہے کہ میرا رجحان تصویریت کے اسی نظریہ کی
 طرف ہے کہ اساسی و بنیادی حقیقت شعور ہے اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے

————— (ماڈرن بلیٹ ص ۵۲۰) —————

مذہب کا وجود اسی ذی شعور و ذی علم اساسی سرچشمہ کائنات کے ہوا کیا ہے اور
 جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم و شعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہے تو
 خرق عادت کے مادی یا میکائیکی عوامل و قوانین کی جستجو خود عقل کی رُو سے کون سی عقلندی
 کا کارنامہ ہے

قوانین فطرت میں اللہ کی مداخلت

انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹال جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصول سائنس" کے نام سے لکھی ہے جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے —

"اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گزری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانہ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لئے قابل تصور نہیں جاسکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود۔" مگر جو شخص اس خالق کائنات کی قوت ہی کا قطعاً منکر ہوا جو ہرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو اور جو آرنسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور متمدن و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ کو (یعنی اولیام و خرافات) قرار دیتا ہو۔ تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے۔ یا جس شخص سے وہ ظاہر ہوا ہے، اس کے عالم غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے۔؟

قوانین فطرت میں خدا کی محسبوری،

اصل یہ ہے کہ حکمائے فلاسفہ نے ارسطو کی تقلید کی ہے اور مسئلہ علت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ ذات واجب الوجود علت اولیٰ یا عقل اول کی علت تامہ ہے اور علت تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا اور اضطرار اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں اس کے

ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا، اس کی صحیح مثال آفتابِ روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی غلبتِ تامہ ہے جب آفتاب نکلے گا روشنی کا ظہور ہوگا۔ خواہ وہ موانع کی وجہ سے نظر نہ آئے اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصد اور ارادہ سے نہیں ہے بلکہ اس سے مجبوراً اور اضطراراً یہ روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ عقلِ اوّل کے پیدا ہونے کے بعد عالمِ کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلہِ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بندھ گیا کہ اب خالقِ اوّل کو اس دستِ اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں — ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیر و سلسلہِ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا، لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ ظاہری سلسلہِ علل و معلول سے نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک طرف لامحالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور دوسری طرف چونکہ وہ خدا کو مضطر اور مجبور مان چکا ہے۔ اس لئے براہِ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور چونکہ بلا سبب اور بے علت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی اس بنا پر اسباب و عللِ خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ سوچ بھی محفوظ نہیں اور خدا کو قادرِ مطلق مانے بغیر چارہ نہیں —

۱۔ — حکمائے اسلام میں مسئلہ خرقِ عادت کا سب سے بڑا منکر بوعلی سینا اشارات میں لکھتا ہے۔
ولکنها تجارب لہما ثبتت طلبا سبأہا
ثم انی لو اذتفتیت جن ثیات هذا الباب
فیما شاہدنا لا و فیما حکى عن
تناہ لطلال الکلام
لیکن یہ تجربے ہیں جب وہ ثبوت کو پہنچ گئے تو ان کے اسباب کی تلاش ہوئی اور اگر اس قسم کے جزئیات کا متبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا ان کے لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سنا ہے تو بہت طول ہو جائے گا۔

فرقِ عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلہ اسباب و علل پر یقین ہے۔

الغرض! فرقِ عادت سے صرف اس فرق کو انکار ہے جو یا خدا کا قطعاً منکر ہے یا یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا اور ناقابلِ شکست سلسلہ علل و معلول کے گورکھ دھند پر یقین کامل رکھتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام نظم کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدہ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باطل کو بھی بلا دلیل تسلیم کئے بیٹھے ہیں اور اس لئے فرقِ عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرات نہیں ہوتی —

سلسلہ اسباب و علل پر علم انسانی کو احتوا نہیں |

(۱) گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لئے ہیں وہ نظام کائنات کے چلانے کے لئے کافی ہیں، اس کیلئے کسی اور کے دست اندازی کی ضرورت نہیں —

(۲) کائنات کے چہرہ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شے کی علت اور خاصیت انہوں نے دریافت کر لی ہے —

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں ذہن نام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس مبلغِ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زینبیس دیتا، جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی بھی ہے ان کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے۔ لیکن حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہے اور اگر اس کے خلاف چلے تو کیا استحالة لازم آئے گا، ایک معجزہ ہے

اور ہمیشہ معمہ رہے گا۔ اجرام فلکیہ اور طبقات ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دور ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ بجلی میں یہ قوت ہے۔ سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں ہے۔ اور نزدیک آؤ، اپنے جسم کی دنیا کو دیکھو، تم صرف یہ جانتے ہو کہ سائنس کی آمد و رفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے۔ نبض کی رفتار، قلب کی قبض و بسط کی ڈوری سے وابستہ ہے، تمہارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے۔ اور خدا جانے عجائب الفناء کے کیا کیا کوششیں دکھاتا ہے لیکن کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے۔ پھیپھڑوں کی دھونکنی کس طرح روز و شب مصروف عمل ہے، دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سرانجام پاتے ہیں، جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفہ علل و اسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دور دراز کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعویٰ علم کس قدر متسمخہ و نیکزبے۔ سائنس دان اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف ”کیسے“ کا جواب دے سکتے ہیں ”کیوں“ کا جواب ان کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ وہ فلسفی بھی ایک نظام خیال پر متفق نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اروعی المنطقیین میں لکھا ہے:

”فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علم الہیات و طبیعات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو، بلکہ وہ مختلف فرقے ہیں اور ان کے اندر آراء اور خیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں۔“

اس اختلاف رائے اور اس خیال کی بناء پر کسی فلسفی کا یہ دعویٰ کہ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے اس لئے ناقابل قبول ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے اس لئے ناقابل تسلیم ہے۔ تو یہ مذہب ہی پر کیا موقوف ہے، ہر نظام فلسفہ کا قائل دوسرے نظام فلسفہ کے بطلان پر اسی قدر قوت سے اس استدلال

کام میں لاسکتا ہے، غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظائرات (سیسٹم) ہیں، درحقیقت وہ اسرار کائنات کے متعلق ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں۔ ان مرتب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے وہ ان کا فلسفہ ہے۔ اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظام خیال رکھتا ہے اور جو لوگ اس نظام خیال پر یقین رکھتے ہیں ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے، اسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظام خیال کے خلاف ہے تو نفس کا یہ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ لازم آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لئے باطل ہے کہ دوسرے نظام فلسفہ کے وہ خلاف ہے۔

نظام عالم کے چلانے کے لئے علل و اسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ یقین رکھنے کیلئے سب سے پہلی بحث آغاز آفرینش کی آتی ہے، آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا سبب یہ ہے۔ لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے۔ یہ نوع بنوع چیز کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں ان نظریات کا ذکر نہ کیجئے، جن کا نام اصول ارتقاء اور انتخاب طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیت مفروض اور وہمیات سے زیادہ نہیں اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ مادہ کی ابتدائی بنیاد چاہے اربع عناصر کو بتائیے یا جو اہر فردہ کو یا سالمات کو یا ایتھر کو یا برق پاروں کو یا جن کو بھی بتائیں لیکن ان کے حدوث کی علت نہیں بتائی جا سکتی اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟ اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بغیر ان کے ان کا پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان، پہلا پرندہ اور پہلا درخت کسی نطفہ، کسی انڈے اور کسی گٹھلی سے پیدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعوے کے خلاف ایک شہاد قبول کر لی اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈہ اور پہلی گٹھلی

انسان پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی، غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخن ہمت سے کس طرح سلجھا سکتے نہیں اور ناچار آپ کو سلسلہ علل و اسباب کے مذہب کے برگشتہ ہونا پڑے گا۔

حقیقی علت خدا کی قدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلہ اسباب و علل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں وہاں بھی بالآخر سپر فلگن ہونے سے چارہ نہیں۔ پانی پادل سے، برسا، بادل بخارات سے بنے، بخارات پانی سے اٹھے جو سورج کی تپش سے گرم ہو کر یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض پانی بخارات سے پیدا ہوا اور بخارات پانی سے پیدا ہوئے۔ اس دور کے عقدہ لائیکل کو آپ حل کر سکتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے اور اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجئے جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ اسباب و علل صرف اس کی مشیت و ارادہ کے مظاہر ہیں اور اپنی عادت کے مطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں، صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لئے عادت کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کر دی علت اور معلولیت کا تعلق جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک نگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اس کی عادت جاریہ یہ یک نگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضر توں کے دفع کے لئے پہلے سے کوئی تیاری نہ کر سکتیں۔

علت و خاصیت اور اس کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے اور اشیاء میں جو خواہیں اور آثار ہیں ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے، محض تکرار احساس سے جس کا دوسرا نام

تجربہ ہے —

جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں اور پھر جب
جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا۔ اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوا
کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے۔ فرض کرو کہ اگر تکرار احساس سے اور یہی تجربہ ہم
کو برف سے حاصل ہو جائے تو یقیناً ہم کہہ دیں گے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی
ہے۔ برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں، دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھتے، کیا ان کی
ذات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس کی بناء پر احساس بلکہ تکرار احساس سے قبل آپ فیصلہ
کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسرے میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے —

آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کا فوراً اور سنکھیا کی تھوڑی تھوڑی مقدار لا کر رکھ دیتے
اس سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے، اب آپ دونوں کو غور سے دیکھتے
اور خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھتے، سوچتے، چکھ کر، چھو کر کس طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ
ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ فیصلہ ناممکن ہے جب تک اُن کا بار بار تجربہ نہ کیا جائے
اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص
اور آثار کا علم صرف یکسانی عمل اور تجربہ پر موقوف ہے —

عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بناء پر ہم علل و معلولات اور اسباب و مسببات کا
مسئلہ قائم کرتے ہیں اور اسی کی بناء پر مدعیان عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں
جس کے پرستاروں کے نام نیچرٹی، میٹرلیسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبعی ہیں
وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ
اُس شے سے اس خاصیت و اثر کا انفکاک قطعاً محال ہے اور جب ایک شے کے بعد
فوراً دوسری شے معلول و مسبب اور پہلی شے علت و مسبب ہے اور یہ کلیہ قائم کر لیتے
ہیں کہ گرمی اور سوزش کا سبب آگ ہے۔ ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے۔

موت کا سبب نہکھیا ہے

یائیوں کہئے، کہ آگ کا خاصہ جلانا، برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کو ختم کر دینا ہے

لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثار و اسباب و علل محض عادی ہیں

تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جب یہ شے پیدا ہوگی تو اس کے بعد دوری شے پیدا ہو جائے گی، لیکن اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا

اسی طریق پر اشیاء اور موجودات اسباب و علل کا علم بدلتا رہتا ہے

عالم سے عادت جو مختلف آثار و نتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لئے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار و نتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور عادتاً ایسا سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی ان سے یہی آثار و خواہ صادر ہوں گے

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے، لیکن ایک صاحب ارادہ سہتی ہے اس لئے اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے

فلاسفہ اور قوانین فطرت

فلاسفہ اور حکماء کی وہ جماعت قوانین فطرت کے ناقابل شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے۔ اور اس بناء پر ثواب سے قطعی انکار کرتی ہے۔ امام ازی نے لکھا ہے کہ گو

خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے کہ وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بناء پر خوارقِ فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔۔۔۔۔

۱۔۔۔ وہ "تولد ذاتی" کے قائل ہیں یعنی کہ یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظامِ خاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک قطرہ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدتِ حمل کے اندر وہ شکمِ مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک متعین زمانہ کے بعد وضعِ حمل ہوتا ہے، پھر شیرخوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند، قوی ہیکل، ذی رُوح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ دفعتاً ان بچ کے منازل کو طے کئے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جاتیں۔۔۔۔۔

یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرہ آب کے زمانہ سے لے کر اس عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعہ عناصر کو جو سالہا سال سے صرف کرنا پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لئے ایک خاص قسم کے اعتدالِ ترکیب کی ضرورت تھی، جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا، حیات پیدا ہو گئی، اس بناء پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیاتِ انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر لطفِ حملِ خون گوشت، وضعِ حمل، شیرخوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے۔ اچھا خاصا ایک نوجوان مٹی کے پتلہ سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ برسات میں اکثر کپڑے مکوڑے رطوبتِ مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی رُوح بن جاتے ہیں۔ اسی کا نام "تولد ذاتی" ہے۔۔۔۔۔

اسی تفصیل کی بناء پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذی رُوح کی پیدائش کے لئے دُنیا میں جو سلسلہ اسبابِ عادۃً جاری ہے،۔۔۔۔۔ اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے، مَرْدے زندہ بھی ہو سکتے ہیں۔ پہاڑ سونا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے

وہ سڑگل کر مٹی ہو جاتا ہے وہ مٹی ایک غذائی صورت میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تولد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیج کے وسائل کے بغیر عرصہ میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے

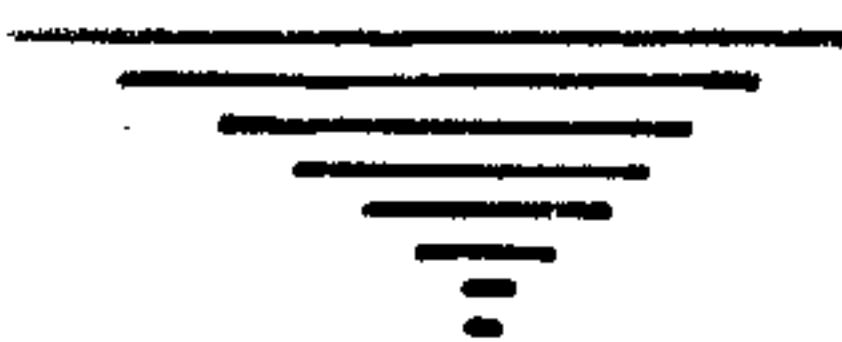
۲۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت کا مادہ (ہیولی) ہی کے تغیرات کے نام ہیں، مادہ (ہیولی) اس تمام عالم عنصری کا ایک ہی ہے اس بناء پر عالم میں انواع اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروڑوں تنوعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا سبب مؤثر اگر بالفرض خود مادہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دنیا میں ایک ہی شکل اور ایک ہی خاصیت ہو۔ تو تم کہو گے کہ یہ اختلاف و تنوع مادہ کے اختلاف استعداد سے پیدا ہوا لیکن استعداد تو تاثر اور انفعال کا نام ہے۔ علت فاعلہ اور سبب مؤثر کیا ہے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اجرام فلکیہ کی گردش اور رفتار ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اجرام فلکی کی اس گردش و رفتار اور اختلاف اشکال کی نہ کوئی حد و نہایت ہے اور نہ کسی قانون فطری کے ماتحت ہیں اور نہ ان کا علم ہم کو ہو سکتا ہے۔ تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائب قدرت اور خوارق فطرت کی وہ کون سی مثال ہے جس کے محال ہونے کا وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۳۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سبب مؤثر کی بناء پر ہوتا ہے، یا بلا سبب مؤثر کے ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرق عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ کہتے کہ یہ حوادث بلا سبب مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ تو گویا آپ نے خود خرق عادت کو تسلیم کر لیا، پھر دنیا میں کوئی عجیب سی عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی اور اگر یہ کہتے کہ یہ سبب مؤثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا یہ سبب مؤثر صاحب اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث تاثر اس کے ارادہ و اختیارات سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث

تائیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرار نہ طبعی طور کمزور ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزانہ اور خوارق کے صدور میں کوئی احتمال نہیں، کیونکہ اس مدبر و مؤثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ شے اسی طرح واقع ہوگی کوئی اس کا مانع نہیں — دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثر عالم سے زمانہ قدیم سے ایک ہی طور سے سرزد ہوتی چلی آتی ہے جیسے آفتاب سے روشنی ایسی حالت میں ایک عام واحد قدیم و ازلی سبب و مؤثر سے یہ ہر نئے آن اور نئے لمحہ میں نئی نئی اور مختلف شکل و صورت اور خواص کی اشیا کیونکہ ظہور پذیر ہوتی ہیں؟ آپ کہیں گے کہ علت تو بے شک واحد قدیم ہے مگر علت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیے۔ مادہ میں یہ استعداد و صلاحیت گردشِ فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے —

لیکن ابھی کہا جا چکا ہے کہ آپ کے نزدیک اشکالِ فلکی کی نہ تو کوئی حدود پایاں ہے اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں۔ اس بنا پر حوادثِ عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردشِ فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ جو پیر آپ کو بظاہر غلافِ فطرت اور غلافِ عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص شکلِ فلکی کا نتیجہ ہو — (مطالبِ عالیہ، از امام رازیؒ)

(ترتیب از عبد الباری ندوی بحث معجزہ سیر البقیہ)



اصول تعلیل کی موت

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشتی ثقل سیاروں، ستاروں، کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

اس سائنسی دریافت کو مہیوم (۱۷۷۶ - ۱۷۸۱) اور دوسرے مفکرین نے فلسفہ بنایا انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصول تعلیل (PRINCIPLE OF CAUSATION) پر چل رہا ہے جب تک اسباب و علل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھتا رہا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والا ایک خدا ہے مگر اب ہم کو اسباب و علل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (CAUSATION) کا مادی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے نہ کہ کوئی مفروضہ خدا۔

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضہ کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے کہ جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔ اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ مذکورہ اصول تعلیل کی کابل تردید ہے۔

The quantum Mechanics theory maintains That at the Atomic Level, Matter behaves Randomly

کو انٹرمیکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹم کی سطح پر مادہ غیر مرتب انداز میں عمل کرتا ہے۔
 سائنس میں کسی "اصول" کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام
 کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا، تو علمی طور پر اس کا مسئلہ
 اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے، چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں
 کرتا جس کا مشاہدہ نظام شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔
 آئن سٹائن کو یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوئی، کیونکہ اس طرح کائنات مادی
 کرشمے کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پاری تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع
 کی۔ اپنی زندگی کے آخری تیس سال اس نے کوشش میں صرف کر دیئے کہ نظام فطرت میں اس
 "تضاد" کو ختم کرے۔ شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کے عمل کو ایک قانون کے تحت
 منظم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا۔
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح
 پر حرکت کا مطالعہ کر کے انسان نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی
 کہ اس کی حرکت معلوم مادی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ باختیار خدا کے وقت آتی
 تصویر کی گویا تردید تھی۔ مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آ گئی۔
 بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرات کی حرکت
 کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں۔

ایک سائنس دان اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:-
 "طبیعیات کے قوانین جو زمین پر دریافت کئے گئے ہیں وہ تحکمی شمار پر مشتمل ہیں۔ جیسے
 الیکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار ماہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے
 مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ کیوں۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انہیں بے شمار کا انتخاب
 کر رکھا ہے۔" (سندے ٹائمز لندن، ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء)۔

یہ الفاظ تئیس کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہیں کہ کائنات انسانی علم کے احاطہ میں نہیں آتی۔ کائنات ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کا ظہور ہے اور خدا کی مرضی کے تصور کے تحت ہی اس کی واقعی توجہ کی جا سکتی ہے۔
(عظمت قرآن از وحید الدین خان)

نظریہ ارتقاء کی تردید

اس کی ایک مثال حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے۔ ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۹) اور دوسرے سائنسدانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں۔ ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔ اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علیحدہ نوع نہیں۔ انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقاء کی کھلی کڑیاں ہیں۔ اور انسان اس سفر ارتقاء کی اگلی کڑی ہے۔

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا، مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے۔ وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا۔ مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی۔ یہ

یہ مدت ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لئے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔
سائنسدانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پریوٹینی سالہ کے مرکب کو ارتقائی
طور پر وجود میں لانے کے لئے کتنے مہاسکھ ملین سال سے بھی زیادہ لمبی مدت درکار ہے
بھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ
سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں۔ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیونکر وجود
میں آ گئیں۔ اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا۔ گنا کہ مفروضہ ارتقاء
کے مطابق لا تعداد مراحل سے گزر کر انسان جیسی اعلیٰ نوع ظہور میں آجائے۔

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات
کے ایک عالم پاجو (Patau) نے حساب لگا پایا ہے۔ اس کے مطابق کسی نوع میں
ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لئے دس لاکھ نسلوں کی مدت درکار ہے۔ اس
سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعہ کتنے جیسے نسل میں ان گنت
تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنے تو اس کے بننے میں
کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا۔

(PAN -

اس شکل کو حل کرنے کے لئے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو پین سپرمیا (SPERMIA -

کا نظریہ کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی
مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور
بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں مائل ہیں۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارے
پر وہ اسباب موجود نہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو و نما پاسکے، مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور
اور بقا کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے
سوا کہیں اور موجود نہیں۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کے

کا نظریہ وضع کیا۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے نہ کہ علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک خلل کرنے والے کا تقاضہ کرتا ہے یعنی اس خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لئے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی۔ وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پاسکتی۔

پروفیسر جان مینار ڈائسمتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء ناقابل حل اندرونی مسائل (BUILT-IN PROBLEMS) سے دوچار ہے، کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہ آپ ہے کیونکہ خدا ایک صاحب ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لاسکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لئے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ چونکہ ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لئے نظریہ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے جب کہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

(عظمت قرآن، از وحید الدین خان)

وجودِ باری تعالیٰ

اور عقلیات

سب سے پہلا سوال جس سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وجودِ باری تعالیٰ کا ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصاً اس سے پچھلے دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالف دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے اہل فلسفہ کی ساری موثر گافیاں انسان کی کوئی واضح رہنمائی کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر:-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
دور کو سمجھا رہا ہے اور سہرا ملتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے کچھ اور بھی تیکھے انداز سے شرکت کی، اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے مادیت پرست سائنس دان اس دعوے کے ساتھ میدان میں اُترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپ لیس نے نظامِ شمسی پر اپنی کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب پنولین نے اس سے تعجب سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں پاتا ہوں۔ تو اس نے کہا "حضور والا! ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں صدی میں یہ یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصور کو ختم کر دیا ہے۔ کائنات کی ایک ایسی

توجیہ کر دی ہے جس میں کسی مدبرِ اعلیٰ اور خالقِ کائنات کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا کہ انسان بہت سی آرا قائم کرنے میں بڑا جلد باز ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کا وجود حسی اور مادی نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعی ہے۔ عام طور پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کیلئے ہم اُسے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں وہ حواس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی حواس کے ذریعہ حاصل کرتی ہے لیکن حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محض مادی اور حسی دنیا تک محدود ہے۔ جو چیزیں ان سے ماوراء ہیں، یعنی طبیعی کی بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو جاننے کے لئے حواس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حواس مجبوراً اور لاچار ہیں اور اس کے حقائق کو جاننے کے لئے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو حسی دنیا سے متعلق ہوں یا حواس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹیفک مطالبہ ہے۔

مادیت پرست سائنس دان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ سائنس زندگی کے ہر عقدہ کو حل کر سکتی ہے جس طرح خشکی کی سواری پانی پر بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبیعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعد الطبیعی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائرہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دنیا کی بات پیش کرنا جو اس کے دائرہ سے باہر ہے اور جس کے متعلق وہ کوئی علم نہیں رکھتی ایک غیر سائنٹیفک بات ہے اور ایسے دعویٰ کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی، سائنس کی صورت یہ ہے کہ۔

۱۔ اس کا دائرہ کار حسی اور طبیعی دنیا تک محدود ہے، اس سے باہر کے بارے

میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی —

۲ — طبعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے — گلی نہیں۔ وہ ایک

خاص پہلو یا جزو کا مطالعہ کرتی ہے پوری حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی —

۳ — اس کا طریق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے اور ایک خاص طریق عمل کے

ذریعہ اس کی حاصل شدہ معلومات سے قوانین، نظریات اور طبعی نظام کے بارے

میں تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ظنی ہوتی ہیں۔ انہیں درجہ یقین

حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجہ میں نسبتاً یقین کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جوں جوں

نظریات اور تعبیرات کا حصہ بڑھتا جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے یہی وجہ ہے

کہ اکثر ایک دور کے سائنسی تصورات دوسرے دور کے سائنسی تصورات کی تکذیب

کر دیتے ہیں اور سرجمیس جینز کے بقول سائنس کا دریا اُلٹے رُخ پر بہنے لگتا ہے۔

۴ — سائنس کے مختلف شعبوں کے حامل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متضاد

بھی ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ فرکس اگر ایک سمت میں رہنمائی کرتی ہے تو بیا بھی

ایک دوسری سمت میں اور سائیکالوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لئے کسی ایک کو

سائنس کہنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہے —

ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے ایک بے رُخ

اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ یہ سوال ہی سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے

میں بجز خاموشی کے اور کوئی موقف اختیار نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی سائنسدان پروفیسر لیتر

نے سچ کہا ہے کہ : —

” کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے

اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔

جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی

واثبات دونوں سے الگ ہے۔“

یہ تو ہے فطری صورت، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں پُرانی سائنسی مادیت کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل رونما ہوا ہے اور سائنس کا نیا رجحان مذہب اور خدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ ایکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہوا ہے اور نظریۂ اضافیت اور نظریۂ کوانٹم کے زیرِ سایہ جس نے پرورش پائی ہے وہ سائنس کو مذہب کے حقائق سے دُور لے جانے کے بجائے ان سے قریب تر لے آیا ہے، عام فضا کی یہ تبدیلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر لی کا مٹے ڈونوائے نے تو اپنی کتاب ”تقدیرِ انسانیت“ اس دعویٰ کے ساتھ پیش کی ہے کہ:۔۔۔

”اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے

آتے ہیں۔“

پروفیسر سولویون نے چوٹی کے سائنس دانوں کے افکار کا جو پنچوڑ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:۔
 ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دُنیا سائنس میں مذہبی نقطہ نظر بھی اتنی ہی حُجَّت و صداقت کا حامل ہے جتنا سائنسی نقطہ نظر۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئی سائنسی دُنیا کے سب سے بڑے ماہر آئن سٹائن کی نظر میں مذہبی فکر ہی سائنسی نقطہ نظر کا ماخذ اور رہبر ہے۔“

اور پروفیسر جیوڈ یہاں کہہ گیا ہے کہ:۔۔۔

”سرجمیس جینز اور سرارٹوائنڈکسن کی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دُنیا کے بارے میں انیسویں صدی کے تصورِ آئن سٹائن میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور

دوستداری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گواپنے نتائج تک پہنچنے کے لئے دونوں کے طریق ہائے تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے۔“

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رخ کا پتہ دیتے ہیں جہاں تک خالص سائنٹیفک طریقہ کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس نئی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلق بالبعد الطبیعیات سے ہے کیونکہ خدا کے وجود کا ادراک جو اس کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کے باوجود عقل سلیم کی رہنمائی کے لئے نفس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراہم کردہ معلومات میں لاتعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مدبر اور صاحب امرستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو، اس کائنات کے حقائق کو دیکھ کر بے اختیار کپکار اٹھتا ہے کہ یہ کارخانہ رنگ و بو ایک حکیم اور دانا خالق اور فرماں روا کے بغیر نہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ قائم رہ سکتا ہے زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نظام کا ایک فرماں روا ہے، نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر قانون کا تصور ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر آخر کس طرح آسکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی

جاری و ساری ہو گیا، اس کائنات میں کمال درجہ کا حُسن و توازن ہے۔ یہ حُسن و توازن ایک منظم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کارفرما ہے جو خیر کو قائم رکھتا اور شر کو ختم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی انتخاب ایک صاحبِ ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک مسلسل، مربوط اور معنی خیز کتاب کی مانند ہے، کیا اس کا کوئی مُصنّف نہیں؟ سر آر تھر کیتھ نے سچ کہا ہے: —

” انسانی دماغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لئے ایک حقیر سا آلہ ہے ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیے لیکن پھر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظم اور مربوط ہے اور فطرت کی نیت نئی ایجادات کیسی حیران کن ہیں۔ ہر سمت میں ایک مقصد کارفرما ہے خواہ ہم عامی ہوں یا سائنسدان، ہمیں کائنات کیلئے ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا پڑے گا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں ہے۔“

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ اس کے لئے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے ایک نقطہ آغاز یقیناً ماننا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں، یعنی یہ کہ آغاز مادّے سے ہوا، دوسرا وہ جو خدا کے ماننے والے کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی سے ہوا۔ —

البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز، یعنی مادّہ ایک صاحبِ شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لئے کہ شعور مجرد مادّے سے بہت بلند ہے۔ لیکن اگر خدا کو، جو خود صاحبِ شعور ہے تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع

۱۵ (سر آر تھر کیتھ "I believe" صفحہ ۱۵۵) (اس باب میں انبیاء کا تصور درست ہے)

ہو جائے، اسی طرح مادہ کو نقطہ آغاز زمان کرکائنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جاسکتی لیکن ایک با اختیار و صاحب ارادہ مہستی کو خالق ماننے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اور تمام مسائل آپ کے آپ حل ہو جاتے ہیں —

مزید برآں اگر ہم خدا کے وجود کو تسلیم نہ کریں اور کائنات کے مبداء مادے کو قرار دیں تو انسانی اور حیوانی وجود کی تشریح بڑی مشکل نظر آتی ہے۔ سرسری طور پر بڑی آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اجزاء ایک تناسب کے ملے اور پودے وجود میں آ گئے لیکن جدید سائنسی ترقیوں کی بناء پر ایسے "اتفاقات" کو ماننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرینک لین کا کہنا ہے: —

"پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں کے اجزاء لازم کی حیثیت رکھتے ہیں پانچ عناصر کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پر مشتمل ہیں۔ ایک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے چالیس ہزار جواہر کا مجموعہ ہوتا ہے، کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ وہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے؟ مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ملنے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔"

"سوئٹزرلینڈ کے ایک حساب دان چارلس ایوہین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیقی یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۰^{۱۶۰} کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایک پروٹینی سالے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے اس پوری کائنات کے موجودہ

ماڈے سے کروڑوں گنا زیادہ مادہ مطلوب ہوگا جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۲۴۲ سال کے بعد ہوگا۔
 ”پروٹین“ امینو ترشوں کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔

اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے ملیں اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کی بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے بی لیڈز نے حساب لگایا ہے کہ ایک مادہ سے پروٹین کے سلسلے کو ۲۴ طریقوں سے یکجا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کئی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ پروٹینی سالمے کو وجود میں لانے کیلئے اتنے بہت سے بعید از امکان اتفاقات بیک وقت صادر ہو جائیں۔
 درحقیقت یہ اکیلی مثال نہیں، بلکہ نباتات و حیوانات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس قسم کی بے شمار مثالوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس سلسلے میں ہم ارتقائی حیاتیات سے متعلق ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

نظریہ ارتقاء کی رو سے حیات کی زیادہ تر ترقی یافتہ شکلیں درحقیقت کم تر ترقی یافتہ شکلوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ چارلس ڈارون کے نظریہ کے مطابق یہ ارتقا محض میکانیکی قوتوں کی بنا پر ہوا ہے۔ لیکن بعد کے ماہرین حیاتیات نے محسوس کیا کہ محض میکانیکی قوتیں ارتقاء کی تشریح نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر آنکھ کے ارتقا کا مسئلہ لیجئے۔ اگر آنکھ کے عدسے کی ایک سطح میں اتفاقاً کوئی معمولی سی تبدیلی بھی ہو جائے جس کے بغیر آنکھ کا ارتقاء ممکن نہیں ہے، تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری سطح میں بھی بیک وقت ایک مخصوص تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اس دوسری سطح میں تبدیلی لکھو کھا شکلوں میں ہو سکتی ہے جس میں سے صرف ایک مخصوص تبدیلی کی ضرورت ہے ورنہ بنیائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، ان دونوں سطحوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قرینہ کی شکل یا

عدسے کے مرکز کے فاصلے میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ اور یہ سب تبدیلیاں بیک وقت ہونی چاہئیں ورنہ بینائی بہتر نہ ہوگی۔

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اس قسم کی بے شمار مثالوں سے سابقہ پڑتا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے پیش نظر ہوا ہے۔

نظریۂ ارتقاء ابتداً دو سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔ ایک چارلس ڈارون اور دوسرا الفرڈ رسل ولاس۔ لیکن بعد میں الفرڈ رسل نے اپنی کتاب شائع نہ کی اور نظریۂ ارتقاء کا بہرہ دارون کے سر بندھا، لیکن ڈارون کے نظریات کے برعکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اس کا خیال تھا کہ "حیاتیاتی دنیا میں کم از کم تین ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوت یا علت کی مداخلت لازمی ہوتی ہے۔ ایک وقت جب کہ پہلے جان دار خلیے کی تشکیل ہوئی۔ دوسرا وہ مقام جہاں سے حیوانات اور نباتات کی زندگی جڑا ہوئی۔ اور تیسرا وہ وقت جہاں انسان عالم وجود میں آیا۔ یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم از کم تین ایسے نمایاں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتفاقات کا سہارا لے کر نہیں ٹالا جاسکتا ہے اور کسی بلند تر قوت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔

ارتقاء کے کائنات کے مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور رب کی ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے۔ نظریۂ ارتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل بے شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی، ہوا اور پانی کی ایک مخصوص شکل قائم ہوئی ہے، موسم کا نظام اور ٹمپریچر زندگی کے قیام اور بقا کے لئے سازگار ہوئے۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے لئے تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا۔ سوال یہ

ہے کہ اتنی منظم، مرتب اور منضبط تبدیلیاں آپ کے آپ کیسے واقع ہو سکتی ہیں؟ ہر چیز ایک دوسرے سے پیوست ہو اور تمام تبدیلیوں کے تعاون و توافق سے زندگی کے آئندہ مراحل طے ہونے کے لائق بنیں، کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب متناسب تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں؟ کیا عقل اسے ملنے کے لئے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک حادثہ اور اتفاق کی بنا پر ہو گیا۔ اگر اس کا نام "حادثہ" اور "اتفاق" ہے تو پھر لغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے پڑیں گے! —

کیا کبھی ایسا "اتفاق" بھی واقع ہوا ہے کہ حروف کو ایک ڈبے میں ڈال کر ہلایا گیا ہو اور جب ان کو دوبارہ زمین پر ڈالا گیا ہو تو ان سے ایک مربوط عمارت بن گئی؟ کیا کبھی ایسا "حادثہ" بھی پیش آیا ہے کہ غالب یا اقبال کے کسی شعر کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر کسی جاہل کو دے دیئے گئے ہوں اور وہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالب یا اقبال کا شعر نکل آئے، حالانکہ حروف، الفاظ، جملے سب وہی ہوں؟ اگر اس طرح ایک شعر نہیں بن سکتا تو یہ پوری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے ہیں؟ — بے شک —

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ
 اُس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو
 مضبوط (منظم پر) بنایا ()

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ رَآهُ تَقْدِيرًا
 خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

حیات و کائنات کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

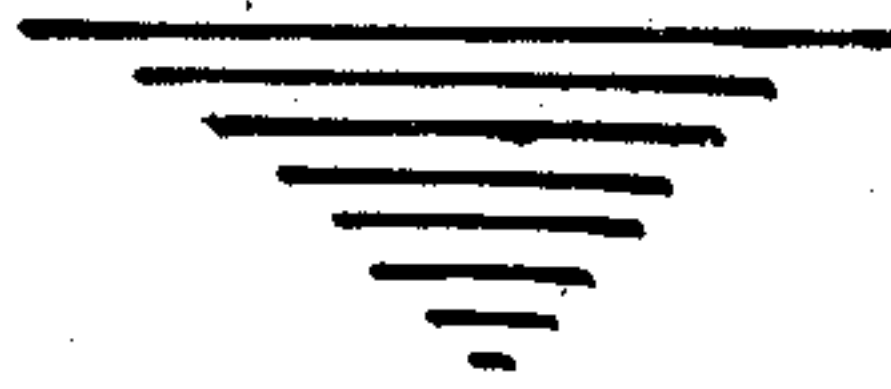
کہ ساری تجربات اور عقل سلیم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اس دُنیا کو
محض اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے۔

اس کی ہر شے

زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ کسی صاحبِ حکمت اور ذی اختیار ہستی نے
اسے وجود بخشا ہے۔ وہی اس کی خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرمانروا

ہے۔

(پروفیسر خورشید احمد)



پڑھیں صاحب لکھتے ہیں :-

قوانین فطرت

اول

جلد ۱ کی مجبوری

قوانین فطرت کسے کہتے ہیں ؟

اس عنوان پر (WHITEHEAD) نے اپنی کتاب (ADVENTURES OF IDEAS) کے ساتویں باب میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے جس کا ملخص ذیل کی سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس مفکر کے نزدیک آج کل قوانین فطرت کے متعلق چار نظریات متداول ہیں —

۱۔ (LAW OF IMMANENCE) اس نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنی ذاتی خصوصیت کی بنا پر قائم نہیں بلکہ ہر شے اپنی ہستی کے لئے دوسری اشیاء کی محتاج ہے۔ لہذا تمام اشیاء میں باہمی رابطہ ہے۔ اشیاء کی ماہیت سمجھنے سے مفہوم یہ ہے کہ ہم اس بنیادی رابطہ کو سمجھ لیں جس سے یہ اشیاء باہم دگر مربوط ہیں۔ اسی رابطہ کو قانون فطرت کہتے ہیں۔ لہذا علمائے سائنس کا کام یہ نہیں کہ وہ فطرت کے فعل کے متعلق اپنے مشاہدات قلم بند کرتے ہیں بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ اس رابطہ دروں کو کو تلاش بھی کریں

۲— (IMPOSED LAWS) اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ہر شے ایک منفرد خصوصیت رکھتی ہے اور اس کی ہستی اسی خصوصیت سے قائم ہے۔ لہذا اپنی ہستی نئے نئے کوئی شے کسی دوسری شے کی محتاج نہیں۔ لیکن ان تمام اشیاء پر خارج سے ایک قانون عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ باہم دیگر ربط و ضبط رکھیں۔ اس خارج سے عائد کردہ قانون کا نام قانون فطرت ہے۔ نیوٹن اور ڈیکارٹ وغیرہ کے نزدیک یہ خارجی قانون خدا کا عائد کردہ ہے یا یوں سمجھئے کہ خود خدا ہے۔ الہیات میں اس تصور کو (DEISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی (GOD AS A PERSON) کا تصور جو کائنات سے باہر بیٹھا ہو (اپنے قوانین کی رو سے کائنات مشینری چلا رہا) ہے —

۳— (OBSERVED ORDER OF SUCCESSION) اس نظریے مقصود یہ ہے کہ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم دیکھتے جائیں کہ کائنات میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور جس طرح کوئی واقعہ ہوتا چلا جائے، اس کے متعلق اپنے مشاہدات قلمبند کرتے جائیں۔ ان مشاہدات کی رو سے جو نتائج مرتب ہوں وہی قوانین فطرت ہیں (یہ میکالکی قوانین کا نظریہ ہے اور اسے سائنس کی دنیا میں (POSITIVISM) کہا جاتا ہے —

۴— (CONVENTIONAL INTERPRETATION) یہ درحقیقت الگ نظریہ نہیں بلکہ حکمائے یونان اور مصر کے اتباع میں ایک قسم کا تقلیدی مسلک ہے اس لئے بحث صرف اول الذکر تین نظریوں تک محدود ہو جاتی ہے —

مندرجہ بالا نظریوں میں تیسرا نظریہ، علمائے سائنس کے نزدیک، سب سے زیادہ قابل قبول رہا ہے اور اسی کی بناء پر سائنس کے میکالکی قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ پہلا نظریہ بھی ایک حد تک مشاہداتی نظریہ ہی ہے لیکن، وہ مشاہدہ کے بعد نتائج کے لئے مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS) کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ نظریہ دوم کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فطرت کے قوانین خارج سے عائد شدہ ہیں اس لئے وہ غیر متبدل ہیں —

لیکن سوال یہ نہیں کہ فطرت کے قوانین کی اصل کیا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کے متعلق جو کچھ سائنس اس وقت دریافت کر چکی ہے وہ حتمی اور یقینی ہے یا اس میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں؟ اگر ان میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سائنس کے مکتشفات یقین کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں، لہذا انہی کی بنیادوں پر زندگی کے مسائل کو حل کرنا چاہیئے۔ اس باب میں سب سے نمایاں سوال جبریت

جبریت و علوم جبریت (DETERMINISM) یا عدم جبریت (INDETERMINISM) کا ہے۔

یعنی یہ سوال کہ مادہ کے افعال متعین ہیں یا غیر متعین۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ میکانیکی تصور کائنات کی رو سے، یہ تمام افعال علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے فلہذا متعین ہیں، لیکن اب بیسویں صدی میں طبیعیات سے متعلق مزید تجارب و مشاہدات نے اس تصور میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ یہ تبدیلی علم الحیات (BIOLOGY) اور طبیعیات (PHYSICS) دونوں میں ہوتی ہے۔ —

ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور اس کا زوال،

علم الحیات میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء ایک حقیقت ثابتہ کی طرح تسلیم ہوتا چلا آ رہا تھا، اس نظریہ کی رو سے کائنات میں عمل ارتقاء لگے بندھے میکانیکی اصولوں کے مطابق جاری ہے۔ یہ اصول علت و معلول کی کڑیوں سے اس طرح بندھے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس میکانیکی کے پیش نظر پروفیسر ٹینڈل نے ۱۸۷۲ء میں برٹش ایسوسی ایشن کے اجلاس میں کہا تھا کہ ”سائنس کی رو سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اولیں مہیولی کائنات کے ایٹم سے لے کر برٹش ایسوسی ایشن کے اجلاس تک کے تمام ارتقائی سلسلہ کا بیک وقت جائزہ لے سکیں“ ڈارون کی (ORIGIN OF SPECIES)

کے بعد ہربرٹ اسپنسر نے بقا، للا صلیح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے نظریہ کے ماتحت اس میکا کی تصور ارتقاء کو مزید تقویت پہنچائی لیکن ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں (VERNON KELLOGG) نے اپنی کتاب (DARWINISM TO-DAY) میں بتایا کہ خود ڈارون ازم کے ماتحت قریب ایک درجن مختلف مکاتب فکر اس وقت تک معرض وجود میں آچکے تھے جن میں خود اس نظریہ کے متعلق اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ویس مین (AUGUST WEISMANN) نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں ڈارون کے بنیادی نظریہ "ماحول" کی تردید کی۔ ازاں بعد ڈریش (HANS DRIESCE) نے اس ساری کی ساری بنیاد کو منہدم کر دیا۔ اس اثناء میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر بیٹسن (BATESON) نے مینڈل (MENDEL) کی تحقیقات کو اپنی تنقید کے ساتھ شائع کیا، جن کی رو سے ڈارون کا بنیادی نظریہ ناقابل قبول قرار دیا گیا۔

المختصر اس پچاس سال میں نظریہ ارتقاء کے بنیادی اصولوں کے متعلق اس قدر مختلف اور متضاد تصورات پیش ہو چکے ہیں کہ (BATESON) کے الفاظ میں: —

"نظریہ ارتقاء اپنے مدہم سے خاکہ کے اعتبار سے واضح ہے اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں لیکن اس نظریہ کی بنیادی اصل جس کا تعلق انواع کی ابتداء اور پھر سے ہے یکسر پردہ باطن میں ہے۔"

یہاں تک تو پھر بھی تحقیقات کا رخ میکا کی اصولوں کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات نے اس بنیادی اصول کو بھی جڑ سے ہلا دیا۔ چنانچہ ان تحقیقات کی رُ سے یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ انواع (SPECIES) میں بعض اوقات اس طرح تبدیلی واقع ہو جاتی ہیں کہ "مطابق بہ ماحول" (ADAPTATION TO ENVIRONMENT)

کا اصول ان کی کوئی توجیہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی ہنگامی تبدیلیوں کو بیدار ترقی کی اصطلاح میں (MUTATION) کہا جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے علم نباتات میں (SPORTS) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک ہی قسم کے بیجوں سے بعض اوقات مختلف قسم کے پھول پیدا ہو

نظریہ فجائی ارتقاء

جاتے ہیں۔ اس انکشاف کا سربراہ پروفیسر مارگن (LLOYD MORGAN) کے سر ہے جس کے نظریہ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اس نظریہ کی رو سے بعض اوقات ایک نوع، علت و معلول کی کئی کڑیاں پھانڈ کر، دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ارتقاء کا میکا کی قانون منہ تکتارہ جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے:-

”اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو (EMERGENT)

کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط

اس قدر ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ

پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں

تو اس کا جواب اتنا ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق

ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

(EMERGENT EVOLUTION)

(DUM) اور (DOBZANSKY) کی جس کتاب (HEREDITY, RACE-

(SOCIETY) کا ذکر پہلے آچکا ہے اس میں یہ سائنسدان اس اہم مسئلہ پر بحث کرتے

ہیں کہ ایک فرد جس قدر خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس میں کتنا کچھ اسلاف سے وراثت

میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کے بچوں

میں خصوصیات کا اس قدر اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں۔

”علم وراثت کا طالب علم آپ سے کہے گا کہ وراثت کے یہ اختلافات (Mutations) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جب آپ سے یہ کمرید کر پوچھیں گے کہ (Mutation) ہوتا کیا ہے تو وہ صرف اتنا بتا سکے گا کہ یہ وراثت میں ایک ہنگامی تبدیلی کا نام ہے وہ اس پر اصرار کرتا جائے گا کہ وراثت کی ان خصوصیات میں اختلاف کا باعث (Mutation) ہے۔ لیکن جب آپ اس سے کہیں گے کہ یہ چیز پیدا کس طرح سے ہوتی ہے۔ تو اسے اس کا اعتراف کرنے پڑے گا کہ اسے تو وہ بھی نہیں جانتا کہ اس ہنگامی تبدیلیوں کا سبب کیا ہے؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایسا ہوتا ضرور ہے۔۔۔۔۔ یہ تبدیلی بس پردہ غیب سے رونما ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔“ (P. 26-27)

جس طرح علم الحیات میں ”اتفاقی حوادث“ رونما ہوتے ہیں۔ اسی طرح علم النفس کی رو سے بھی اس قسم کے ”ناگہانی حوادث“ ہوتے ہیں جو ان تمام قوانین و ضوابط کے خلاف ہوتے ہیں جن کے ماتحت عام انسانی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہم نے (BEHAVIOURISM) کے عنوان میں دیکھا تھا کہ علم النفس جدید کی رو سے انسانی بچہ کی سیرت و کردار مجموعہ ہوتی ہے اس کے موروثی اثرات، ابتدائی ماحول، تعلیم اور تربیت کا۔ یا پھر ان غددوں کا جو اسے طبعی طور پر متواتر ملتے ہیں۔ لیکن ایک (Genius) کی پیدائش ان تمام صلوں کے خلاف عمل میں آتی ہے۔ وہ وراثت، ماحول، تعلیم، تربیت، غرضیکہ تمام خارجی اثرات کے علی الرغم ایک مختلف سیرت کا پیکر اور جداگانہ کردار کا حامل ہوتا ہے۔ پروفیسر (L. HOG BEN) اس باب میں رستم طراز ہے :-

”تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کا یقین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم

قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں (THE NATURE OF LIVING MATTER)

انہی انکشافات کے پیش نظر پروفیسر (TAYLOR) کو کہنا پڑا ہے کہ:-
 ”اُن تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے
 محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ یہ شے اپنے نشوونما
 کے بعد ایسی خصوصیت کا مظہر بن جائے جو اُن عناصر میں کہیں بھی نہ ہو
 جن سے اس شے نے ترکیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے۔
 کہ ان تمام عناصر کی خصوصیات کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی
 خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE)

اب جدید انکشافات کی رو سے مادیین نے اب اپنی

قدیم اصطلاح مادیت (MATERIALISM) کو چھوڑ

نیچرل ازم

کر یا ایک نئی اصطلاح، فطرت (NATURALISM) وضع کی ہے۔ اس نظریہ کی رو
 سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ (۱) تمام کائناتی افعال کا سرچشمہ نیچر ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ
 انتہا۔ (۲) نیچر صرف ایٹم (ATOMS) کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ اور (۳)
 اس تخلیقی عمل میں ایسی ایسی کئی خصوصیات کا ظہور ہوتا رہتا ہے جن کے مشہود ہونے سے
 پہلے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا ہوں گی۔ ان نئی خصوصیات کو (EM-
 ERGENTS) کہتے ہیں۔ اس بناء پر سب سے پہلے (EMERGENT) خود زندگی ہے۔ اور اس کے

بعد دوسرا (EMERGENT) نفس یا شعور، اس گروہ میں سب سے پہلے زیادہ نمایاں
 ہستی پروفیسر الیگزینڈر (SAMUEL ALEXANDER، ۱۸۵۹-۱۹۳۸) کی ہے جس نے
 اپنے مجموعہ خطبات (SPACE TIME AND DEITY) میں بتایا ہے کہ جب کوئی شے

اپنے ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد اس سطح کے ارتقاء سے ایک نئی فجائی سطح (EMERGENT LEVEL) اُبھرتی ہے۔ اس حقیقت کا نام الیگزینڈر کی اصطلاح میں (DEITY) ہے وہ اسے خدا سے الگ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک "خدا اس کائنات کا نام ہے جس میں (DEITY) عمل پیرا ہے"۔

اصول تعدیل اور خدا کی مجبوری

اب آئیے خود طبیعیات کی طرف۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کلاسیکل فزکس میں نظریہ علت و معلول (CAUSALITY) کو ایسا غیر متبدل سمجھا جاتا تھا کہ علمائے طبیعیات کے نزدیک "خدا بھی چاہے تو سلسلہ علت و معلول میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔" لیکن اب نظریہ کو انٹم (QUANTUM THEORY) کی رو سے ثابت کیا جا رہا ہے کہ کائنات میں غیر متبدل اور جامد قانون علت و معلول کی جگہ "غیر تعین" (NACY-INDETERM) کا قانون نافذ العمل ہے۔ آئن سٹائن برگ (AR HEISENBERG) کے "اصول غیر تعین" کی رو سے ایک برقیہ (ELECTRON) مقام (POSITION) بھی رکھتا ہے اور رفتار (VELOCITY) بھی۔ لیکن ان دونوں کا بیک وقت علم نہیں ہو سکتا۔ ایک برقیہ کا مقام جس قدر یقین کے ساتھ کر لیا جائے اسی قدر اس کی رفتار غیر متعین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس قدر یقین کے ساتھ اس کی رفتار متعین کر لی جائے اس کی پوزیشن غیر متعین ہو جاتی ہے۔ لہذا سائنس کے لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ ایک برقیہ "چھلانگ کر" کدھر جائے گا۔ اسی بناء پر علمائے طبیعیات اب اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ "فکر انسانی میں قانون علت و معلول" | **قانون علت و معلول غیر متعین ہے**

ایک لازمی عنصر نہیں رہا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میکس پلانک کی کتاب (WORLD OF NATURE CAUSALITY IN THE)۔ خود آئزن برگ لکھتا ہے کہ "مقادیر کی میکا نمکس کی رو سے یہ متعین ہو چکا ہے کہ علت و معلول کا قانون باطل ہے۔" اس نئے نظریہ نے فلسفہ اور اخلاقیات کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے، اس لئے کہ پُرانے نظریہ علت و معلول کی رو سے انسان مجبور محض تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اب اس نظریہ کی رو سے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ تسلیم کرنے کے لئے طبعی دلیل بہم پہنچ گئی ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر جیمز مرفی، میکس پلانک کی کتاب (RE IS SCIENCE GOING) کے دیباچہ میں لکھتا ہے: —

"نظریہ کو انتظم، جو اثرات فلسفہ پر مرتب کر سکتا ہے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بعض علمائے طبیعیات نے اس امر کا حتمی اعلان کر دیا ہے کہ اس نظریہ نے سائنس کی تحقیقات کی دنیا میں پُرانے اصول علت و معلول کو یکسر خارج کر دیا ہے۔"

ہر برٹ سمیوئل اس باب میں لکھتا ہے: —

"اب طبیعیات علت و معلول کے متعین قانون کی پابند نہیں رہی۔ قانون تعین اب رخصت ہو گیا اور اس میں شبہ کی بجائے شے نہیں کہ وہ اب واپس نہیں آ سکتا، اس لئے انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق سائنس کو جو اعتراض تھا۔ اُسے اب سائنس واپس لیتی ہے۔"

(CONTEMPORARY) —

سر جیمز جینس اپنی کتاب (MYSTERIOUS UNIVERSE) میں لکھتا ہے۔

ہمارے "اختیار و ارادہ" کے عقیدہ کے خلاف اب سائنس کے پاس کوئی ناقابل تردید دلیل نہیں رہی۔"

ایڈنگٹن کہتا ہے : —

” اب جو شخص جبر کا عقیدہ رکھتا ہے اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ عقیدہ اُس کے اپنے خیالات کی پیداوار ہے۔ اُسے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک ایسا عقیدہ رکھ رہا ہے جس کی تائید سائنس کے تجرباتی دلائل سے

ہو سکتی ہے۔“ (NATURE OF THE PHYSICAL WORLD - BY EDDINGTON)

یہ ہیں سائنس کے وہ جدید انکشافات جس کے پیش نظر (MAX PLANCK) قوانین

فطرت کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ : —

” ہمیں اب فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ کوئی خاص قوانین فطرت موجود

ہیں یا یہ کہ اگر کوئی خاص قوانین اس وقت تک موجود ہیں تو آئندہ بھی

ایسے ہی رہیں گے۔ یہ بات بالکل قابل فہم ہے کہ کسی سہانی صبح فطرت

کسی ایسے خلاف توقع واقعہ کو ظہور میں لے آئے جس سے ہم سب ہلکے

ہلکے رہ جائیں۔ اس صورت میں ہم بے بس ہوں گے کہ اس کے خلاف

لب کشائی کر سکیں۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو.... ایسے حالات

میں سائنس کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اپنی ہتھی دامن کا

اعلان کر دے۔“

(UNIVERSE IN THE LIGHT)

اس مقام تک ہم نے دیکھ لیا کہ سائنس کی جدید تحقیقات کی رو سے علت

و معلول کی وہ تمام عمارت جس کی بنیادوں پر میکا نیکی تصور حیات قائم تھا، کس طرح

منہدم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ اب ”عدم تعین کا قانون“ (RMINACY -

LAW OF INDETE) لے چکا ہے۔

ہم صرف ان چند مثالوں تک اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ بتانا تھا کہ تحقیقات

جدیدہ کی رو سے سائنس کی جڑ بنیاد ہی نہیں بلکہ اس کے بنیادی اصول تک بدلتے جا رہے ہیں۔ بقول (WHITEHEAD) —

”سائنس کے فکر کی قدیم بنیادیں اب ناقابل فہم ہوتی جا رہی ہیں۔
زمان، مکان، مادہ، ایٹم، برق، میکانیکیٹ نامیاتی نظام، ترتیب
اجزاء، ساخت، قالب، افعال، سب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔“
(SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

اسی بناء پر پروفیسر نڈکور آگے چل کر لکھتا ہے کہ: —
”سائنس تو الہیات سے بھی زیادہ قابل تغیر و تبدل ہے۔ آج سائنس
کا کوئی عالم گلیڈیو کے عقائد یا نیوٹن کے معتقدات کو بلا مشروط تسلیم کرنے
پر آمادہ نہیں۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے دس سال پہلے کے معتقدات کو بھی
علیٰ حالہ صحیح تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ (Page 212)
آئن سٹائن کے الفاظ میں: —

”سائنس کا قانون صرف آخر قرار نہیں پاسکتا، اس لئے کہ جوں جوں
سائنس ترقی کرتی جاتی ہے۔ وہ تصورات جن کی بنیادوں پر وہ قوانین مبنی
ہوتے ہیں، نامکمل ہوتے ہیں اور ناکافی ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں۔“

(QUOTED BY MOSZKOWSKI)

یہی وجہ ہے کہ (MACH) کے الفاظ میں ”اب علمائے سائنس اپنے نظریات کو
اس حتم و یقین کے ساتھ پیش نہیں کرتے جس طرح شروع شروع میں میکانیکی تصورات
کے حاملین پیش کیا کرتے تھے۔“

(THE REACTION AGAINST IDEALISM)

اسی بناء پر (KENNETH WALKER) نے کہا ہے کہ:

”سائنس کے نظریات، فکر انسانی کے لئے سستانے کے مقامات ہیں۔ جب کسی نئی حقیقت کے انکشاف سے معلوم ہو کہ فلاں نظریہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اسے فوراً چھوڑ دینا چاہیے۔“

(MEANING AND PURPOSE) —

اور آج کے نظریوں کے متعلق بری فائلٹ (BRIFFAULT) کی تنقید قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: —

”ہمارے طبیعیاتی و حیاتیاتی نظریئے آنے والی نسلوں کو اسی طرح عجوبہ دکھائی دیں گے جس طرح ہمیں آج اُس زمانہ کے نظریئے مضحکہ انگیز دکھائی دیتے ہیں جب سائنس اپنے عہد طفولیت میں تھی —

(THE MAKING OF HUMANITY)

اس باب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ سائنس کی دنیا میں اُنیسویں صدی تک بنیادی اصول بطور مسلمات تسلیم ہوتے چلے آئے ہیں بعد کے انکشافات نے انہیں کس طرح بدل دیا اور اُن کی جگہ ایسے اصولوں نے لی جن سے انسانی فکر کائنات اور خود انسان کے متعلق ایک بُرا گمانہ زاویہ سے سوچنے لگا۔ اس وقت تک کی بحث کے نتائج یہ ہیں: —

(۱) میکا نکی تصور حیات کی رو سے مادہ کو مادی شکل کا مستقل جوہر حاصل | **مبحث** سمجھا جاتا تھا لیکن تحقیقات جدیدہ کی رو سے مادہ، روشنی کی لہریں، مربوط حوادث یا مہمجد خیالات تصور کیا جانے لگا۔ اور اصطلاحی فرق کو چھوڑ کر اب اس حقیقت کے اعتراف پر سب متفق ہیں کہ مادہ کی ابتدا مادی کائنات سے نہیں ہوئی۔ اس کی اصل ”رُومانی“ دنیا سے متعلق ہے۔ —

جو مادہ کے بجائے مطلق توانائی: حرکت محض یا رُوحِ خالص سے متھور

ہے۔ اس دُنیا کا نام ”غیب کی دُنیا“ یا غیر مرئی عالم قرار دیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس غیب کی دُنیا کا علم ہمارے حواس کے ذریعے ممکن نہیں —

۳۔ زندگی، مادّہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا تعلق بھی اس غیب کی دُنیا سے ہے

۴۔ شعور، زندگی کے ارتقاء سے وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس کا تعلق بھی اسی غیر مرئی

عالم سے ہے —

۵۔ میکائیلی تصوّر حیات کی رو سے یہ مانا جاتا تھا کہ فطرت کے قوانین علت و

و معلول کی جامد کڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ قوانین ”اندھی فطرت کی اندھی قوت“

کے ماتحت ایک مشین کی طرح کام کئے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ

حک و اضافہ۔ لیکن اب تحقیقات جدیدہ کی رو سے فکر انسانی یہ تسلیم کر رہا ہے کہ خود

طبیعیات کی دُنیا میں بھی قوانین فطرت متعین نہیں ہیں بلکہ حوادث اسی طرح رونما

ہوتے ہیں کہ ان کے ظہور میں آنے سے پہلے ان کے متعلق کبھی حتم و یقین سے کچھ کہا ہی

جا سکتا —

۶۔ سائنس کی رو سے پیدا شدہ تصوّرات کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں

کر سکے، بلکہ ان میں آئے دن تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ نہ ہی اب علمائے سائنس کا

یہ دعویٰ ہے کہ ان کے تصوّرات مطلق اور قول فیصل کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں —

بنابریں، سائنس اب معترف ہے کہ وہ کائنات کی حقیقت کا علم بہم نہیں پہنچا

سکتی۔ جب اس کے تجارب کے نتائج آخری اور یقینی صورت اختیار کر لیں گے اس وقت

بھی وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے ایک پہلو کے متعلق جزئی طور پر علم بہم پہنچا سکے

گی، حقیقت کا کلی ادراک اس کے بس کی بات نہیں — (انسان نے کیا سوچا؟ از پرویز مشرف ص ۱۸۸)

۱۵۔ پرویز صاحب کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر پابندی عائد کر دی ہے کہ ان قوانین فطریہ کو تبدیل نہ کرے گا۔ اس مقالے میں دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے نظریے کی تردید کر رہے ہیں۔

(اسدی)

پرویزی مسکت ہیں

جبل کا تصور!

پرویز صاحب کتاب "التقدیر" میں خدا کا تصور اس طرح بیان کرتا ہے۔ اس کا ملخص مفہوم یہ ہے: —

کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور ارادے میں مکمل طور پر آزاد تھا، اس نے اس وقت جس طرح چاہا کائنات کی ہر چیز کو اپنی فطرت کے مطابق پیدا کر دیا، یہ اس کا تخلیقی ورک ہے۔ سرسید کی اصطلاح میں اسے ورک آف گاڈ *WORK OF GOD* کہتے ہیں۔ پرویز لکھتے ہیں۔ پیدا ہونے کے بعد کائنات کی ہر چیز اسی طرح عمل کر رہی ہے جس طرح فطری قانون کے تحت اسے مقدر کیا گیا تھا، مثلاً آگ کی فطرت جلانا ہے وہ تا ابد جلانے کا کام کرتی ہے گی۔ پانی کی فطرت برودت ہے وہ اپنی برودی فطرت کا پابند رہے گا، تخلیق کے بعد اب اگر اللہ چاہے کہ اپنے حکم سے آگ کی فطرت کو برودت میں اور پانی کی فطرت کو حرارت میں تبدیل کر دے تو وہ ان

کی اس مودعہ فطرت کو اس لئے تبدیل نہیں کر سکتا کہ اس کا یہ حکم اس کے اپنے سابقہ فعل کے خلاف ہو جائے گا، حالانکہ قرآن پاک میں انبیاء کرام کے جتنے معجزات بیان کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجزہ کا صدور خرق عادت کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب تک کسی فطری قانون کو تبدیل نہ کیا جائے معجزہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ —

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلانے کے لئے جس آگ کا اہتمام کیا گیا تھا جس وقت آپ کو اس آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: —

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرًا وَسَلَامًا
ہم نے اس آگ کو حکم دیا کہ خبردار
اے جلانا نہیں بلکہ ان پر ٹھنڈی

اور راحت کا باعث بن جا۔

دیکھئے جس خالق فطرت میں آگ کی فطرت میں حرارت و دلچت کر رکھی تھی قرآن مجید ثابت کر رہا ہے کہ وہ خالق فطرت اس آگ کی مودعہ فطرت کو اپنے حکم (قلنا) سے تبدیل بھی کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے قبل جس طرح اپنی مشیت اور ارادے میں آزاد تھا تخلیق کے بعد اب بھی اسی طرح صاحب اختیار ہے۔ اگر اس طرح اسے اس دنیا میں بے اختیار ثابت کیا جائے تو پھر خدا کو ایسی صفات کا حامل ماننا پڑے گا جن میں کسی وقت تغیر بھی آ سکتا ہے۔ تغیر قبول کرنا حادث کی صفت ہے اور خدا پر یہ بات محال ہے۔ خدا کو اگر قوانین فطریہ کے تبدیل کرنے میں مجبور مانا جائے۔ ظاہر ہے مجبوری کہاں ہوتی ہے جہاں اس کے مقابلے میں کوئی چیز زیادہ قوت رکھتی ہو؟ دیکھئے خدا کے اس تصور میں کتنا نقص ہے جو خدا اپنی قدرت سے تخلیق تو کر سکتا ہے، لیکن تخلیق کے بعد اپنی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، حالانکہ کسی چیز کی تخلیق اور اس کی فطری تبدیلی میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے، کیونکہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز پہلے معدوم تھی اللہ نے اپنی مشیت سے پیدا کر کے اسے ظاہر کر دیا اور فطری تبدیلی کا یہ مطلب ہے کہ

کسی موجود چیز میں اس کی کسی طبعی صفت میں تغیر پیدا کر دیا جائے، آپ نصف کریں کہ کسی چیز کو معدوم سے موجود کرنا یہ زیادہ اشد ہے یا ایک چیز جو سامنے موجود ہے اس کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرنا یہ زیادہ مشکل ہے؟ —

قیامت کے منکرین کو یہ شبہ تھا کہ انسان جب موت کے بعد گل سڑ جاتا ہے تو قیامت میں یہ وجود دوبارہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے —

اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: —

بھلا تمہارا دوسری مرتبہ پیدا کرنا فی نفسہ زیادہ سخت ہے یا تخلیق کے لحاظ سے اس آسمان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے —	ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ السَّمَاءُ بِمَا هَا
---	---

دیکھئے قیامت میں انسان کو دوبارہ پیدا کرنے میں جو ظاہری اشکال نظر آتا تھا اس اشکال کو تخلیق کے تفاوت کے ساتھ دور کر دیا کہ آسمان جو ایک وسیع جسامت کا حامل ہے۔ اس کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا انسان جو ایک معمولی ڈھانچے کا مالک ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب اشد امور میں پوری قدرت رکھتا ہے تو اہل امور میں وہ کس طرح مجبور ہو سکتا ہے؟ —

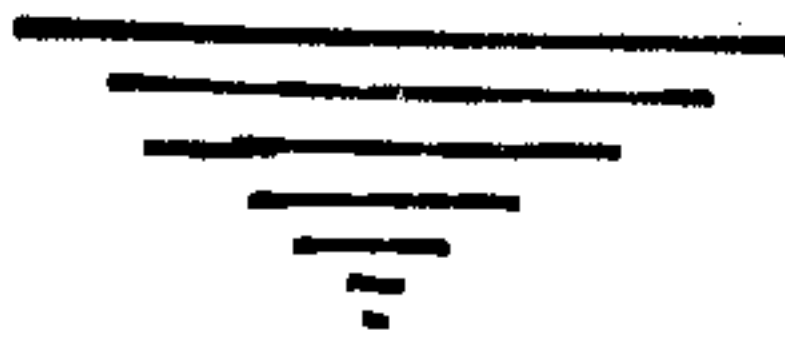
جس نظریے میں خدا کو مجبور، بے بس اور اس کے مقابلے میں نیچر (Nature) کو زیادہ قوی مانا جا رہا ہو تو پھر حقیقی خدا کا اطلاق بھی اس وجود پر زیادہ صحیح ہوگا، جو ان

دونوں میں زیادہ پاور کا حامل ہوگا —

پرویز صاحب کے اس نظریے میں الحاد کی جس انداز کے ساتھ ترجمانی کی گئی ہے ہمارے نزدیک دوسرے کسی باطل نظریے میں بھی ایسی تحریف موجود نہیں ہے۔

قرآن کا معجزہ ہے کہ :-

جب کوئی باطل نظریہ اس کے مقابلے میں متصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے دلائل کے ساتھ اس کا ریزہ ریزہ کر دیتا ہے — ہم پرویز صاحب کا ایک علمی اقتباس درج کر رہے ہیں۔ دیکھئے کہ پرویز صاحب خود اپنے ہاتھوں سے اُس نیچرل ازم (Naturalism) کی تردید کر رہے ہیں جس کے تحت خدا، قوانین فطریہ کے سامنے مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے —



قوانین فطرت اور معجزات

آزاد ڈاکٹر عبدالحق (صدر شعبہ، جامعہ پنجاب)

حسی معجزات بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی فعلیت کے مصدقہ مظہر ہیں جن کی تکذیب خود اللہ تعالیٰ کو جھٹلا دینے کے مترادف ہے، تاہم ثانوی طور پر ان کا ایک زمانی و مکانی پہلو بھی ہے جس کے لحاظ سے یہ ان واقعات پر مشتمل ہیں جو قوانین فطرت میں دخل انداز ہو کر ان کے عمل کو عارضی طور پر روک دیتے ہیں۔ زیر نظر بحث کا تعلق معجزات کے اسی مؤالذکر پہلو سے ہے۔

اسلامی فکر کی تاریخ میں ہمیں حسی معجزات کے بارے میں دو متناقض قسم کے نظریات ملتے ہیں۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب کے سب بلا واسطہ اور براہ راست اللہ کی مشیت اور اس کے ارادہ سے ہوتے ہیں کوئی ایسے اصول و قوانین موجود نہیں جو فطرت میں از خود کار فرما ہوں اور جن کی معروضی نوعیت کو سائنسی تجربات تحقیق سے دریافت کیا جاسکے، مثال کے طور پر اگر آگ میرے ہاتھ کے جل جانے کے درمیان اور پانی پینے اور پیاس کے بجھ جانے کے درمیان کوئی ایسا باہمی تعلق نہیں ہے جسے ہم علت و معلول کا رشتہ کہہ سکیں۔ — دراصل خدا خود اپنے ذاتی ارادے سے میرے ہاتھ میں جلنے کی کیفیت یا میرے معدہ میں پیاس کے بجھ جانے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا ہر سانحہ چاہے وہ کسی سطح پر رونما

ہو رہا ہو خود خدا ہی کے ارادے کا مہم ہون منت ہے۔ گویا تمام معجزات معمول کے عین مطابق اور سرسری فطری ہیں اور تمام فطرت کلیتہ معجزات پر مشتمل ہے۔ یہ بالخصوص فرقہ اشاعہ کا نظریہ تھا جنہوں نے قرآنی آیات اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی خالص لفظی تعبیر کو قبول کر لیا تھا، ان کا عمومی موقف یہ تھا کہ اگر ہم کائنات میں موجود ارادی یا غیر ارادی فعلیتوں کو تسلیم کر لیں تو اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے پر حرف آئے گا اور اس کی طاقت محدود ہو جائے گی، محققین کے نزدیک یہ نظریہ حماقت سے خالی نہیں —

اس فلسفہ علت و معلول کے بالکل برعکس نظریہ یہ ہے کہ قوانین فطرت میں ریاضیاتی اور منطقی لزوم کی سی حتمیت موجود ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی فعل قوانین فطرت کی خلاف نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قوانین اُس کے عملی عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معتزلہ نے اسی نظریے کو اختیار کیا تھا۔ جدید مسلم فکر میں سرسید احمد خان کو اس نقطہ نظر کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے اور پر وزیر بھی اسی نظریے کا شارح ہے —

ان کی رائے یہ ہے کہ خدا جو قوانین بھی چاہے بنا سکتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ انہیں بنا دیتا ہے تو پھر وہ مستقل طور پر نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ سرسید کی یہ رائے دراصل انیسویں صدی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دی گئی جانی چاہیے۔ وہ دور عمومی طور پر مادیت کے عروج اور فطری قوانین کی جبریت پر ایمان و اعتقاد کا دور تھا۔ اس نظریے کا اہم نقص یہ ہے کہ اس میں خدا محض مجبور ثابت ہوتا ہے —

ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان کا نظریہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو قوانین

۱۔ — پر وزیر نے اپنی کتابوں میں اس نظریے کو کافی پھیلا رکھا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا

ان قوانین فطریہ کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے — اس کا یہ نظریہ اس کے

الحاد کی پوری ترجمانی کرتا ہے — (اسدی) —

فطرت موثر رہتے ہیں لیکن جب خدا چاہے ان میں دخل انداز ہو کر کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر کر سکتا ہے۔ جسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہتے ہیں اور جو متعلقہ شخص کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ — طور ذیل میں اس موقف کی فلسفیانہ توجیہ کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھرپور عمل دخل بھی ثابت ہو جاتا ہے اور قوانین فطرت کی ساکھ بھی قرار دیتی ہے۔ —

یکسانی اور تحلیل کے قوانین بلاشبہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظ ہے کہ یہ قوانین وجود کے مختلف مدارج میں مختلف انداز سے کار فرما ہیں جب ایک فطرتی سائنسدان (Natural Scientists) قوانین اور ان کی حکمرانی کی بات کرتا ہے تو اس کے تصور میں بالعموم صرف مادی قوانین ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادہ درجات وجود میں سے صرف ایک درجہ ہے۔ اس کے علاوہ حیات اور شعور کے درجات بھی ہیں۔ یہ تینوں یعنی مادہ، حیات اور شعور اپنی اپنی تحلیل میں منفرد ہیں۔ حیات، مادے سے اعلیٰ اور شعور خود زندگی سے برتر ہے۔ جب یہ مختلف طبقات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے تو ہر اعلیٰ علیت، ادنیٰ علیت پر اثر انداز ہوگی اور اس میں تغیر پیدا کرے گی۔ —

وہ شخص جو محض مادی سطح پر سوچنے کا عادی ہے اُسے اس نوعیت کے مظاہر پر یقیناً احساس ہوگا کہ قوانین فطرت کے خلاف بات ہو گئی ہے۔ وہ اس اختلاف کی تصویب (Justification) کے لئے مادی کائنات ہی کی طرف رجوع کرے گا لیکن اُس کی یہ کوشش کبھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ اپنی تحقیق میں کائنات کے اعلیٰ مدارج کو نظر انداز کر رہا ہوگا۔ —

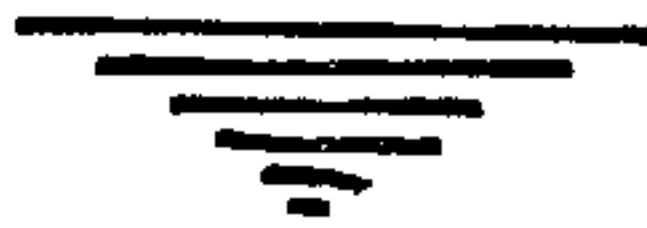
ایک عام آدمی کو ان تین طبقات کے علاوہ کسی شے کا تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب ان سے ماوری رُوح اور اس کے درجات کا بھی

ذکر کرتے ہیں، کوئی غیر معمولی واقعہ جو روحانی قوت کے ذریعے کسی پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی، بشرطیکہ ہم لفظ فطرت کو وسیع ترین مفہوم میں ساری کائنات پر محیط سمجھیں۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک برتر سطح کی علیت ادنیٰ سطح کے وجود میں تخلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔ اب اگر ہمارا خدا ایک شخصی خدا ہے جیسا کہ یقیناً ہے اور قرآن کا بھی واضح طور پر یہی موقف ہے تو پھر الوہیت کی سطح پر بھی ایک خاص نوعیت کی علیت موجود ہونی چاہیے جو اپنے تمام ماتحت طبقات پر اثر انداز ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر سکے، جس طرح حیات مادہ کے افعال بدل سکتی ہے اور شعور حیات کے اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے، اسی طرح ایک شخصی خدا میں بھی یہ قدرت اور قوت ہونی چاہیے کہ ہر شے کو اپنے وسیع تر مقاصد کے مطابق کر سکے۔ یہی معجزہ ہے، اس سے مراد۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہے ان قوانین کو، جنہیں خدا کی عادات یا اس کی سنت کہہ سکتے ہیں ہرگز توڑا نہیں جاسکتا۔ تاہم ایک نہایت محدود مفہوم میں ایک تر قانون اپنے سے ادنیٰ قانون کی کارفرمائی میں دخل انداز ضرور ہو سکتا ہے، جس کے نتیجے میں کسی خاص مرتبہ وجود کے اندر ایسے افعال رونما ہوتے ہیں جن کی توجیہ اُسی مرتبہ کے لئے مخصوص علل و معلولات کی روشنی میں نہیں کی جاسکتی۔

قرآن حکیم میں "ایمان بالغیب" کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اُسے معجزات کی بحث سے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتداء میں ان افراد کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں ایمان بالغیب کی حیثیت بنیادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ اصطلاح ایک بغیر سوچے سمجھے اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) پر دلالت کرتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، قرآن کتاب مبین ہے۔ اس سے استفادہ کرنے کیلئے

جو طریق کار بھی تجویز کیا جائے اس میں (Mystification) کا عنصر ہر حال موجود نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان دراصل علم و معرفت ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ اس یقین محکم سے عبارت ہے جس کے مطابق مرئی حقائق سے مادی مؤثر صداقتیں موجود ہیں اور محسوس اشیاء ہی کل کائنات نہیں ہیں قرآن نے یقیناً مادی کائنات کی اہمیت اور اس کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف مظاہر کو محض آیات الہیہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فطرت کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعتاً موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے اندر کچھ مابعد الطبعی اور تصویری جہتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو ان جہتوں سے نا آشنا ہیں کائنات کو عملی اعتباراً خود بخود سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خدا ایک مؤثر اور فعال ہستی نہیں ہے جو ہماری دعاؤں کو قبول کرتی ہے جس سے معجزات کا صدور ہوتا ہے جو انسان کے ساتھ ایک شخصی رشتہ استوار کر کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ان جہتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہم اس زمان و مکان کی کائنات پر جس قدر زیادہ غور کریں گے معجزات پر ہمارا یقین و ایمان اُسی قدر راسخ ہوتا جائے گا۔

(مانوز)



سائنس کے جدید تصورات ہیں

دہریت کا خاتمہ

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں:-

جب نیوٹن نے سترھویں صدی کے اواخر میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی اور مشہور فرانسیسی ریاضی دان لاپلاس نے تو یہاں کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکاٹکس ایک ہی ہوکتی ہے اور اس میکاٹکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس سے آگے کسی اور کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں اس میکاٹکس کی جڑیں اس قدر مضبوط اور وسیع ہو گئیں۔ کہ نہ صرف طبیعی علوم میں بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی ان کا اطلاق کرنے کی کوشش کی جانے لگی، علوم فلکیات، طبیعیات، کیمیا، اور حیاتیات میں اس غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی اور ظاہر میں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ لہذا ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں شروع سے آخر تک علت و معلول کا ایک سلسلہ کار فرما ہے جس کی بناء پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے۔ نہ کسی خالق کی ضرورت ہے

نہ قیوم کی —

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات اُنیسویں صدی کے آخری حصے میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اُسی زمانے میں پے درپے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت اور معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تصورات نے نیوٹن اور میکول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کو انٹیم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔ ان نئے تصورات کی کماحقہ تشریح کے لئے تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی لیکن ان کو کسی حد تک بتائے بغیر آگے بڑھنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ اس مضمون کا دار و مدار بھی ان تغیرات پر ہے جو جدید سائنس میں رونما ہوئے۔

ہیں — اُنیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادے کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسم شے ہے، جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم نہیں یا معدوم نہیں کیا جاسکتا، جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں کسی ذرے کی طرح حرکت کرتی ہے۔ آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی —

اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرے کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔ جدید طبیعیات میں مادے اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا اور تجربوں سے ثابت ہو گیا

ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مافے میں۔ جب کوئی ذرہ حرکت کرتا ہے تو اس کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور جب وہ ذرہ ساکن ہوتا ہے تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ ایک مادہ کی شے کبھی ذرے کی طرح ایک خط میں اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ مادے کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی راز اصل اصول ہے جس کی بناء پر

جوہری بم بنایا گیا ہے —

جوہریا (Atom) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادے کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں پتا چلا کہ ہر جوہر کے اندر بہت سے دوسرے ذرے ہوتے ہیں جو تین قسم کے اجزاء الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جوہر کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ہر جوہر کا مرکزی حصہ جس کو NUCLEUS کہا جاتا ہے۔ اس کی ساری توانائی اور منفی کامرکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست و ریخت سے جوہر کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور جوہری توانائی بھی حاصل ہوتی ہے —

کیمیائی عنصر سے متعلق سابقہ تصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادے سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے، جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ، چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصر کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا وہی امر محال ہے جس کی تلاش میں ازمندہ وسطی میں متعدد کیمیا گروں نے اپنی عمریں ضائع کی تھیں، لیکن آج کل یہ کیمیا گری لیبارٹری میں ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہے۔ ایک عنصر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن کو ISOTOPE کہا جاتا ہے اور

لیبارٹری میں مصنوعی طور پر SOTOPE | تو کیا نئے عنصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور
 گذشتہ چند سال میں ۱۲ سے زیادہ نئے عنصر یورینیم کے اوپر بنائے جا چکے ہیں —
 مذکورہ بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق
 آ گیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم
 ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی اور محض قوانین حرکت کی
 بنیاد پر علم ریاضی کی مدد سے اس کی تمام حالتوں کو از ازل تا ابد یہ معلوم کیا جاسکتا ہے
 سائنس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا اور جس کی بنیاد پر
 وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کائنات
 کی حالت ہر لمحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن مادہ اور توانائی اور ذرہ اور موج کی ثنویت (DUALITY) اور زمان و
 مکان کی اضافیت کی بنیاد پر ۱۹۲۶ء میں ہائی زن برگ نے ثابت کیا کہ مظاہر فطرت
 میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین یا امکان پایا جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ کسی وقت بھی
 بے شمار ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی طرح قوانین قدرت
 تعینی نہیں بلکہ اوسطی (STATISTICAL) ہو جاتے ہیں۔ اور انیسویں صدی کے
 سائنس میں جو کٹر قسم کی سائنس پائی جاتی تھی، باقی نہیں رہتی۔

اسی کے ساتھ آیہ شریف ”اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ کا مفہوم
 بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ جب مادہ اور روشنی میں غیریت نہیں رہی تو مادی اشیاء
 کے خالق کا غیر مادی ہونا خلاف قیاس نہیں ہو سکتا اور دہریوں کے استدلال میں
 کوئی جان باقی نہیں رہتی۔

۱۹۲۲ء - ۱۹۲۳ء کے بعد جب نیلس بوہر کے کوانٹم نظریے میں یکے بعد دیگرے
 متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۱۹۲۵ء - ۱۹۲۶ء میں نئی کوانٹم

میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی انتہائی حقیقت یا غایت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر یہ بتایا ہے کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے، بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے۔ اس طرح سائنس کا طریق کار اور دائرہ عمل نئے نئے سائنس سے متعین ہو جاتا ہے اور فلسفہ یا مذہب کے ساتھ کسی تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس سے بھی آگے چلئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اسامی تصدیق میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے۔ انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے تمام بنیادی قوانین استقرائی یعنی INDUCTIVE طریقے پر اخذ کئے جاتے تھے مثلاً قانون تجاذب ہی کو کیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادی اجسام کے درمیان ایک معین مقدار کی تجاذبی قوت پائی جاتی ہے، خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برقی مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منعکس یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔

لیکن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لئے جو قانون اور یا مفروضہ اختیار کیا وہ استقرائی نہیں بلکہ علیاتی - EPISTEMOLOGICAL

یا فلسفیانہ ہے۔ اس اصول کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ طبیعی قانون ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تمام مشاہدین کے لئے غیر متغیر ہوں۔ خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت یا سکون میں کیوں نہ ہوں، یہ مفروضہ جس پر نظریہ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے، استقرائی نہیں ہے

اسی طرح عدم تعین کا اصول جس پر جدید قوانم میکائلس کا دار و مدار ہے، استقرائی بلکہ علمیاقتی ہے۔
 پروفیسر ایڈنگٹن نے ساس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دل چسپ
 مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک سائنس دان
 کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ تاکہ ان مچھلیوں کے طول سے
 متعلق کوئی قانون بنا سکے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی
 ہیں، ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی
 مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا سائنس دان
 دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ کہیں قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت
 کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول
 کے ہیں، شرفعی ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی
 جاسکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانون فطرت
 کی تشکیل کے لئے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی
 قوانین کی بہ نسبت زیادہ دُور رس اور دیرپا قانون بنائے جاسکتے ہیں، کیونکہ استقرائی
 قوانین تو ایک بھی مخالف مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نیوٹن کے قانون
 تجاذب کے متعلق معلوم ہوا کہ سیارہ عطارد کا مدار اس قانون کی بنا پر غلط حاصل
 ہوتا ہے تو اس قانون کو ترک کر دینا پڑا۔ (اقبال اور فلسفہ زمان و مکان ص ۲۴)

خدا کی عظمت

— اَوَّل —

سائنس کا عجیب

سائنسدانوں کی جماعت اپنے آلات سے مسلح ہو کر اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں بیٹھی تھی کہ خدا کے انکار کے لئے مواد فراہم کیا جائے۔ لیکن وہ خدا کا اقرار کر کے اٹھی، چنانچہ سرجمیز مشہور سائنسدان نے خدا کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے : —

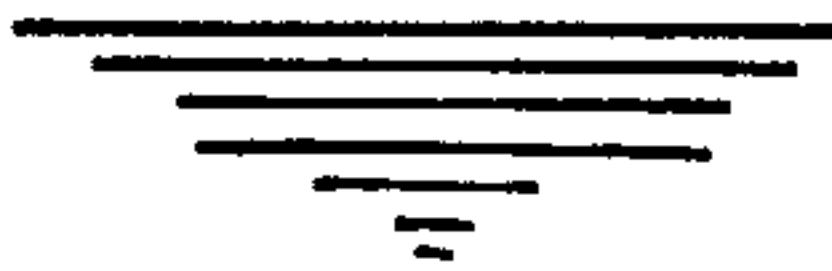
” انتہائی حقیقت ایک اور صرف ایک ہے ابدی اور کائناتی

روح باقی سب اسی کی مخلوق ہیں — ”

ابتداء خدا کے نام سے جو بغض پیدا ہو گیا تھا وہ خدا کے اقرار کے باوجود اب بھی قائم ہے اس آخری حقیقت کو خدا کہنے کے باوجود کوئی ابدی روح کہتا ہے تو کوئی (REALITY-ULTIMATE) اور کوئی (UNIVERSAL MIND) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سارے الفاظ کا مفہوم وہی ہے جس کے لئے لفظ خدا استعمال ہوتا ہے۔ وہ خدا کے لفظ کے اس لئے گھبراتے ہیں کہ اس کا صحیح تصور صرف اسلام ہی پیش کر سکتا ہے۔ اور یہ لوگ اسلام لانے سے بچھکتے ہیں —

نیوٹن کا قانون کشش (LAW OF GRAVITATION) ہو یا ماکس پلانک
(MAX PLANCK) کا کوئنٹم نظریہ یا ڈارون کا نظریہ ارتقاء (THEORY-
EVOLUTION) ہو یا انتہائی حقیقت (ULTIMATE REALITY) کی
تلاش یہ سب اُوپنچی باتیں ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں کوئنٹم نظریہ نے نیوٹن کے قانون
کشش کو رد کر دیا ہے اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء اب تک ثابت نہ ہو سکا لیکن عام پڑھے لکھے
لوگوں کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ ان چیزوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔ گویا مسلمہ
حقیقتیں ہیں۔ اس مرعوبیت کی وجہ سائنسی ایجادات ہیں جیسا کہ فلپ فرانک نے کہاہے۔
"سائنس کے نظریات سے زیادہ عوام و خواص کے ذہنوں کو سائنسی ایجادات
نے مرعوب کر رکھا ہے۔"

عوام کی اس ناواقفیت اور مرعوبیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مذہب کے مخالفین
نے سائنس دریافتوں سے ایسے اُلٹے پلٹے نتیجے اخذ کئے تاکہ خدا کی خالقیت سے بچا جاسکے۔
چنانچہ سر آر تھر کیتھ (SIR AKTHER KEITH) نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ
کیا ہے۔ "ارتقاء (EVOLUTION) نہ صرف نا ثابت بلکہ ناقابل ثبوت ہے
لیکن ہم اس کو مانتے ہیں اس لئے کہ اس کا واحد بدل نظریہ تخلیق ہے جس کی تفہیم ہمارے لئے
بڑی مشکل ہے۔"



رَبِّ الْعَالَمِينَ کی تشریح

کائنات کا نظام ربوبیت کس طرح چل رہا ہے؟

جس زمین، چاند اور سورج کو ہم کُل کائنات سمجھتے تھے وہ سارا نظام شمسی کُل کائنات کے ایک بڑے محیط میں صرف ایک ذرہ کے برابر ہے۔ ہماری زمین جس نظام شمسی میں شامل ہے اس کی وسعت کا یہ حال ہے کہ ہماری زمین کا قطر تو کُل بارہ ہزار سا سو پون کلومیٹر ہے جبکہ جیو پیٹر (JUPITER) کا قطر ایک لاکھ بیالیس ہزار سات سو پون کلومیٹر اور نظام شمسی کے مرکزی سورج کا قطر ۱۴ لاکھ کلومیٹر ہے۔ یعنی زمین سے ۱۰۹ گنا بڑا ہے۔

قطر کی یہ وسعت تو کچھ بھی نہیں جبکہ اس کے مقابل اگر ایک لاکھ کو ۹۵ کھرب ضرب دی جائے تو اس کے حاصل ضرب کے برابر کلومیٹر کا قطر ہماری کہکشاں کا ہے جس کا عرض ۲۰ ہزار ضرب ۹۵ کھرب کلومیٹر ہے اس کو (MILKYWAY) یعنی دو دھیاں کہکشاں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کہکشاں میں ہمارا نظام شمسی شامل ہے۔ اس کہکشاں میں ایک لاکھ بلین یعنی سو ارب ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہمارا پورا نظام شمسی اس کہکشاں کے ایک چھوٹے سے کونے میں پڑا ہے۔ اب تک انسانی مشاہدہ ایسی ایک سو ارب کہکشاؤں کا سراغ لگا چکا ہے۔

یہ تو تھا جسامت کا اندازہ اب فاصلوں کا اندازہ کیجئے کہ زمین، سورج سے صرف

۱۵ کروڑ کلومیٹر دور ہے جبکہ نیپچون ستارہ (NEPTUNE) سورج سے ۴ ارب ۹۴ کروڑ
 ۵۰ لاکھ کلومیٹر دور ہے۔ پلوٹو (PLUTU) کا سورج سے فاصلہ ۵ ارب ۱۹ کروڑ کلومیٹر
 ہے۔ یہ فاصلے اس وقت بہت معمولی رہ جاتے ہیں جب ملکی وے (MILKYWAY)
 کا فاصلہ ۹۲ ہزار ضرب ایک ہزار ضرب ارب کلومیٹر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہکشاؤں
 کے فاصلے جو اب متعین ہو رہے ہیں وہ ہندسوں یا لفظوں میں پورے نہیں لکھے جاسکتے۔
 شاید اس بات سے کچھ اندازہ لگایا جاسکے کہ اضافت کے حساب سے کائنات کچھ
 اتنی جگہ میں سمائی ہوئی ہے کہ مکعب سنٹی میٹر میں ایک ہندسہ لکھیں اور پھر اس کے آگے ۸۴
 صفر لگائیں یا اسی پیمائش کو مکعب کلومیٹر میں لیا جائے تو ایک کے آگے ۶۹ صفر لگائے جائیں
 تب حساب پورا ہو۔ اس کے باوجود کائنات محدود ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، جہاں
 اور فاصلوں کے اعداد و شمار سے آپ اللہ تعالیٰ کا خیال کیجئے کہ وہ کس قدر عظیم ہے اور پھر
 سوچیے کہ کیا ہم اللہ کو واقعتاً اتنا ہی عظیم سمجھتے ہیں اور اس کی عظمت و جلالت کے سامنے
 اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

اب ذرا اور آگے بڑھیے اور وقت کا اندازہ لگائیے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی
 ہدایت دانوں نے ایک کہکشائی نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے متعلق اندازہ ہے کہ اس
 کی جو شعائیں اس سے چار ارب نوری سال سے بھی پہلے روانہ ہوئی تھیں وہ آج ہم تک
 پہنچی ہیں۔ ستاروں کا فاصلہ ماپنے کے لئے ہمارے اعداد و شمار ناکافی ہیں اس لئے
 نوری سال کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ نور یعنی روشنی ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر سفر طے
 کرتی ہے۔ اس طرح ایک سال میں اس کا سفر تقریباً ۹۵ کھرب کلومیٹر ہوگا۔ یہ فاصلہ نوری سال
 کا ہے۔ اب ۴۰ ارب کو ۹۵ کھرب سے ضرب دیجئے تو کہکشاں کا ایک سرے سے دوسرے
 تک کا فاصلہ یا وقت معلوم ہوگا کہ ایک روشنی جو ایک کہکشاں سے چلی ہے وہ ہمارے
 کمرہ تک کتنے وقت میں پہنچی۔ تازہ ترین مشاہدہ میں ایسی کہکشاں بھی دیکھی گئی ہے جس کی روشنی

ہم تک دس ارب نوری سال میں پہنچی ہے یعنی اس نے ۱۰ ضرب ۹۵ کھرب کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے —

مزید دیکھتے! سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات میں ایک مرکز کھکشال ہے جس کے گرد تمام ستارے چکر کاٹ رہے ہیں ان کا چکر تیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ یہ تو اب آپ کے لیے بہت معمولی بات ہوگی کہ ہمارے سورج کی عمر کا اندازہ پانچ ارب سال ہے جبکہ کائنات کی عمر تقریباً پندرہ ارب سال ہے —

ہم ان اعداد و شمار سے صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری کائنات جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ وقت۔ حجم اور فاصلہ کے اعتبار سے کس قدر لامحدود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ازلی وابدی عظمت و کبریائی کا انداز لگانے کے لئے وقت کے یہ سارے پیمانے، حجم کے یہ نکل اندازے اور فاصلوں کی یہ تمام پیمائش بالکل ناکافی ہیں —

اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی جملہ وسعتوں سے بھی بہت بلند و برتر ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہاء اور جو نظم حکمت صنائی اور باہمی مناسبت ان اربوں کھکشائوں اور ان کے گرد گردش کرنے والے ستاروں یا سیاروں میں پائی جاتی ہے اور ہم زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دور دراز دنیاؤں کے مشاہدے کرتے، ان کے فاصلے ماپتے اور ان کی قیاس کے حساب لگاتے ہیں تو اس سے ہم کو خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و حکمت کا اندازہ ہونا چاہیے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی لامحدود بڑی لامحدود کائنات کی ایک ایک چیز باہمی جذب و کشش کے قانون میں کس قدر حکمرانی ہوئی ہے کہ بڑے سے بڑا کمرہ اپنے مدار سے ایک اینچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ قاعدے اور قانون کے تحت مکمل نظم و ضبط اور منصوبہ بندی کے تحت مصروف کار ہے۔ ہم جوں جوں اپنے مشاہدات میں آگے بڑھتے جائیں گے ہمارا ایمان پختہ سے پختہ ہوتا جائے گا —

مادی انسان کے لئے غیر مادی خدا کا مشاہدہ ناممکن ہے، پھر بھی اس کی بنائی ہوئی

چیزوں کی معلومات اس کی عظمت اور کبریائی کا تصور دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔
خدا کی عظیم الشان تخلیق ایک طرف اس کی عظمت کا نقشِ دل و دماغ پر بٹھاتی ہیں اور دوسری
طرف انسان کی کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے۔ —

پروفیسر کاسکی نے خبر دی ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو صبح ۳ بج کر ۱۴ منٹ پر
سورج میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کی سطح پر ایک بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔
یہ شگاف اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تین زمینیں سما سکتی ہیں۔ یہ وہی سورج ہے
جو روزانہ مشرق سے طلوع ہو کر اپنی پوری چمک دمک دکھلا کر مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔
چونکہ یہ روزانہ کا معمول ہے اس لئے ہماری توجہ کامرکز نہ بن سکا۔ اور نہ ہم نے کبھی یہ سوچا کہ یہ سورج
کیا ہے؟ کیسے مسلسل چمکتا رہتا ہے؟ یوں تو دیکھنے میں عام لگا ہوں سے یہ سورج ہماری زمین
سے بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں اس میں سما سکتی ہیں۔ اس کی تیز
چمک کی وجہ سے اندر کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ —

سورج گہن کے وقت جب سورج کی ٹکیہ چاند کی آڑ میں آجاتی ہے تو سورج کے
کنارے کا حصہ آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ تحقیقات کے مطابق سورج کی ٹکیہ
کے چاروں طرف دو سو میل ایک فضا ہے جس کو فوٹو اسفیر (PHOTO SPHERE)
کہتے ہیں۔ — اور اس کے اوپر دوسری تہیں جن کو کروٹو اسفیر (CORONOSPHERE)
اور بالکل باہر کی تہہ کو کورونا (CORONA) کہتے ہیں۔ سورج کی تشری پر بہت سے دھبے
حرکت کرتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں جن کو سن اسپاٹ کہتے ہیں۔ —

ان دھبوں کا قطر (DIAMETER) چند سو میل سے لے کر ساڑھے ہزار میل تک ہوتا
ہے۔ سورج کے کنارے والے حصہ سے لمبی لمبی لپٹیں نکلتی ہیں جن کو اسپیکولس (SPICULES)
کہتے ہیں۔ یہ سیکڑوں میل اوپر اٹھتے ہیں۔ اور چار پانچ منٹ کے اندر واپس آجاتے
ہیں۔ اس مختصر بیان سے سورج کے بارے میں تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رہا اس کی گرمی کا

سوال تو بقول سر جیمز جینز (SIR JAMES JEANS) کے سورج کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو صرف آلیپین کے سر کے برابر ہوا تھی گرمی رکھتا ہے کہ یہی ٹکڑا ایک ہزار میل کی دوری پر رکھ دیا جائے تو انسان کو ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے —

کائنات میں لاتعداد سورج ہیں ہمارا سورج بھی انہیں میں سے ایک ہے مگر چونکہ یہ سب سے قریب ہے اس لئے بہت چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرے سورج بہت دور ہیں۔ اس لئے ان کی چمک اتنی تیز نہیں ہوتی۔ ان دور دراز سورجوں کی دوری کروڑ یا ارب دو ارب میل نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس اتنا بڑا کوئی عدد ہی نہیں ہے جس سے ان کی دوری کو بتلایا جاسکے، چنانچہ ان کی دوری کو ناپنے کے لئے ایک مستقل اکائی (Unit) مانی گئی جس کو نوری سال (LIGHT YEAR) کہتے ہیں —

روشنی بہت تیز چلتی ہے یعنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل چلتی ہے تو ایک منٹ میں اس کا ساٹھ گنا چلے گی (۶۰ ضرب ۱۸۶۰۰۰) میل اور ایک گھنٹہ میں (۶۰ ضرب ۱۸۶۰۰۰) میل چلے گی اس طرح ایک دن میں (۲۴ ضرب ۶۰ ضرب ۱۸۶۰۰۰) میل چلے گی۔ اسی رفتار سے پورے ۳۶۵ دن چلتی رہے تو جو فاصلہ طے کریگی اس کو ایک نوری سال (LIGHT YEAR) مانا جاتا ہے —

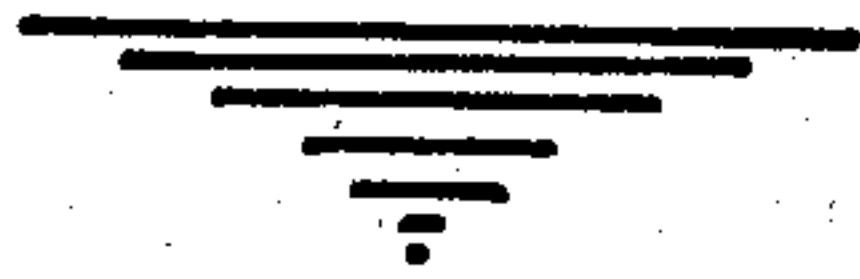
ان دور دراز سورج تک روشنی پہنچنے میں سینکڑوں سال لگ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سورج ہم سے کتنی دور ہیں۔ بعض سورج ہمارے سورج سے بہت زیادہ روشن ہیں جو نیلے رنگ کے دکھائی دیتے ہیں اور بعض ہمارے سورج سے کم روشن ہیں جو سرخ رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں سورجوں میں رگیل (REGAL) بھی ایک سورج ہے جو ہمارے سورج سے پندرہ ہزار گنا زیادہ روشن ہے۔ اتنا ہی ایک دوسرا سورج ہے جو جسامت میں اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمارے سورج جیسے تین کروڑ ساٹھ لاکھ سورج رکھے جاسکتے ہیں — ہر سورج کے گرد بہت سے سیارے (PLANETS) بھی ہوتے ہیں جو اپنے

سُورج کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سورج اور ان کے گرد گھومنے والے سیاروں کے جُھرمٹ کو نظام شمسی (SOLAR SYSTEM) کہتے ہیں جس نظام شمسی میں ہماری دنیا شامل ہے اس میں کل نو سیارے شامل ہیں جن میں قریب ترین مری (MERCURY) اور بعید ترین پلوٹو (PLUTO) ہے جس کی سورج سے دوری چار ارب ساٹھ کروڑ (۴۶۰۰۰۰۰۰۰) میل ہے۔ ہمارے نظام شمسی کے بارے میں یہ مختصر معلومات اس بات کے لئے کافی ہیں کہ ہم کو اندازہ ہو جائے کہ یہ نظام شمسی کتنا بڑا ہے۔ اتنے بڑے نظام شمسی میں ہماری زمین کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کائنات میں نظام شمسی بھی ایک نہیں بلکہ لاتعداد نظام شمسی ہیں۔ یہ نظام شمسی جگہ جگہ جھرمٹ بناتے ہیں۔ جن کو گلیکسی (GALAXY) کہتے ہیں۔ گلیکسی بھی لاتعداد ہیں جس گلیکسی میں ہمارا نظام شمسی ہے اس میں تین ارب (۳۰۰۰۰۰۰۰۰) سورج مع اپنے نظام شمسی کے موجود ہیں۔ اور ان تین ارب سورجوں میں جو سورج ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنا دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچنے میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ بہت سے گلیکسی مل کر نیبولا (NEBULA) بناتے ہیں۔ اور کائنات میں نیبولا بھی ایک دو نہیں اب تک ان کی تحقیقات کے مطابق بیس لاکھ نیبولا کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ جو نیبولا ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنا دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچنے میں دس لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ جوں جوں زیادہ طاقت ور دُور نہیں بنتی جا رہی ہیں نیبولا کی تعداد کی جانکاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

سر جیمز جینز (SIR JAMES JEANS) نے صحیح کہا تھا: "دنیا کے سارے سمندروں کے ساحلوں کے بالوں کے ریزے کون شمار کر سکتا ہے اور وہ کون سا عدد ہوگا جو اس تعداد کو ظاہر کر سکے؟ ایک ٹھیک بالوں کے ریزے شمار سے باہر ہیں۔ اس کے کہیں زیادہ آسمان کے تارے ہیں۔"

یہ کائنات کتنی بڑی ہے؟ اس کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک

طرف اپنی حقیرستی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ وسیع و عریض کائنات دُنیا نظامِ شمسی
 گلیکسی اور لاتعداد نیبولا تو بے اختیار بول اُٹھتا ہے۔ "کائنات کا خالق کتنا عظیم ہے"
 وہ سوچنے لگتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا، اس کی عظمت اور
 کبریائی کا تصور بھی ذہنوں میں نہیں سما سکتا۔ انسان کو اپنے علم کی محدودیت کا احساس
 ہونے لگتا ہے کہ وہ دُنیا کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے —
 نظامِ شمسی کے بارے میں تو اس کی معلومات اور بھی کم ہیں۔ گلیکسی اور نیبولا کے بارے
 میں تو اس کی معلومات صفر کے برابر ہے کائنات کیا ہے؟ — کتنی بڑی ہے؟
 اور پھر اس عظیم کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا؟ — اور اس کا تصور تو انسان کر ہی نہیں
 سکتا۔ اس لئے جو تصور اللہ کے پیغمبروں نے دیا ہے وہی صحیح ہے —



ساری کائنات کو

کس نے تھام رکھا ہے !

سورة فاطر میں فرمایا گیا : — إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ

ان تزولا ولئن زالتا ان امسكهما من احد من بعدا (سورة فاطر ۴۱)
اس کا تفسیری ترجمہ یہ ہے : —

"یعنی اسی (اللہ) کی قدرت کا تصرف ہے جو اتنے بڑے بڑے گروں کو
اپنے مرکز سے ہٹنے اور اپنے مقام و نظام سے ادھر ادھر سرکنے نہیں دیتا۔
اور اگر بالفرض یہ چیزیں اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو پھر بغیر خدا کے کس کی طاقت
ہے کہ ان کو قابو میں رکھ سکے۔"

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اجرام سماویہ محققین جدید کی تحقیقات کے مطابق مختلف نظاموں
سے وابستہ ہیں۔ ہر چند اجرام کا علیحدہ ایک مستقل نظام ہے جس کے ماتحت وہ مصروف گردش
رہتے ہیں۔ یہ مختلف نظام ایک دوسرے سے ہزاروں بلین نوری سال کی رفتار کی دوری
رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اجرام سماویہ کے بعد کا اندازہ لگانے کے لئے ماہرین فلکیات نے

روشنی کی رفتار کو معیار بتایا ہے۔ چنانچہ ان کے حساب کے مطابق روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھپاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتی ہے۔ زمین سے جو سیارہ سب سے زیادہ قریب ہے اس کی روشنی زمین پر تقریباً ساڑھے چار سال میں پہنچتی ہے۔

لہذا فلکیات کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ وہ ہم سے نوڑی ساڑھے چار سال دور ہے۔ بعض سیارے جو زیادہ دور ہیں ان کی روشنی ہم تک ایک ہزار نوڑی سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتی ہے۔ اس قدر فاصلے کے باوجود یہ سب نظام ایک نظام اعلیٰ کے تحت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ ان نظامات سیارگان میں ہی سے ایک نظام وہ ہے جس سے ہمارا تعلق ہے جسے نظام شمسی کہنا سے موسوم کیا گیا ہے۔ شمس (سورج) اس نظام کا مرکز ہے اور دوسرے سیارے جن میں ہماری دنیا کا سیارہ بھی شامل ہے۔ اس کے گرد اپنے اپنے انداز میں گھومتے ہیں۔ سورج کے گرد گھومنے والے یہ سیارے اپنے حجم اور بُعد میں مختلف ہیں۔ تاہم یہ سب اپنی مقررہ رفتار سے اپنے مخصوص حلقہ گردش میں اس باقاعدگی کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں کہ نہ ان کی رفتار میں ایک منٹ کا فرق ہو سکتا ہے اور نہ ان کے مدار میں ایک انچ کا۔ ان سب کی اپنی اپنی معین جگہ دائرہ سائر رکھنے کے لئے جو سنت الہیہ کام کر رہی ہے۔ اسے اصطلاح فلکیات میں جاذبیتِ عامہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر یہ جاذبیت ان کا صحیح توازن قائم نہ رکھے تو عظیم کرے (اجرام سماویہ) ایک دوسرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جائیں اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے ہی تصرف قدرت کی کار فرمائی ہے کہ اس نے اجرام سماویہ کے ہر نظام کے مختلف عظیم کڑوں کو اور پھر تمام نظاموں کو جن میں ہمارا نظام شمسی بھی شامل ہے ایک سنت محکمہ سے باہم مربوط و منظم کر رکھا ہے۔ اگر اس کی قدرت و حکمت ہمارا اٹھالے تو کائنات کی کونسی طاقت

ہے جو اس مربوط نظام کو قابو میں رکھ سکے۔ چنانچہ جب وہ ایسا کرنا چاہے گا تو ہو گا اور اسی کا نام قیامت ہے —

اور دوسری آیت : —

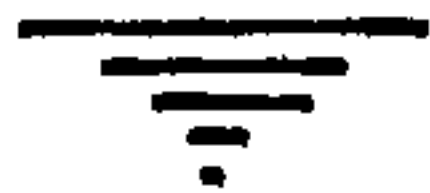
”وَيُمْسِكُ السَّمَاءُ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بَازْنَةً“
(ترجمہ) اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے
مگر جب اس کا حکم ہو تو گر جائے گا —

اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال اجرام سماویہ کا یہ محیر العقول نظم اہل دانش و بینش کے لئے ”اللہ جل شانہ“ کی وحدانیت اس کی عظمت و قدرت اور اس کی وسعت و رحمت کا بہترین نشان ہے۔ جنہوں نے اسے دل کی آنکھوں سے دیکھا وہ تو۔
”سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَظِيمٍ“
کے والہانہ نعموں میں گم ہو ہی گئے —

ہندوستان کے ایک مشہور مستشرق کی برطانیہ کے مشہور سائنس دان سر جیمز سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس ملاقات کے تاثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں : —

”چائے کی میز پر بیٹھ کر سر جیمز نے اجرام فلکی کے مہیب نظام ان کی پیچیدہ شاہراہوں ان کی تندری پرواز ان کے محیر العقول حجم اور بے کراں وسعتوں پر وہ ایمان افروز بحث کی اور اللہ کی حکمت و دانش پر اس رنگ میں روشنی ڈالی کہ میں وجد و خیرت کی دو گانہ کیفیت میں کھو گیا — اور خود سر جیمز کا یہ حال تھا کہ وہ الہی دانش کی دہشت سے تقریباً لرز رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور سر کے بال سیدھے اٹھ بیٹھے تھے —

(قاموس القرآن سجاد میرٹھی ۵۴ء)



تخلیق انسان کی

انفسی دلیل

اس کائنات میں سب سے بڑی حقیقت اور خالق کائنات کا شاہکار خود انسان کا اپنا وجود ہے جو اپنے جسم و جُثہ کے اعتبار سے گو بہت بڑا نہیں مگر اس کی ساخت پر غور کیجئے تو انداز ہوتا ہے کہ اس جلیشی شین آج تک کوئی نہیں بنا سکا نہ کبھی بنا سکے گا، پھر اربوں انسانوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی بالکل کاپی نہیں ہوتا۔ آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ مرد کے مادہ تولید کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں ڈھائی کروڑ حیوانات منویہ موجود ہوتے ہیں۔ ان نصف ارب جراثیموں میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن صرف ایک جراثیمہ عورت کے بیضہ میں نفوذ پاتا ہے جو انسان کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔ اسی طرح ہر بالغ عورت کے مخصوص حصے میں ۴۰ لاکھ ناپختہ انڈے موجود رہتے ہیں۔ مگر ان میں صرف ایک انڈا پختہ ہو کر اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ۲۴ گھنٹے تک اس کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اگر مرد کا کوئی جراثیمہ آکر اس میں داخل ہو جائے تو وہ ایک مکمل حیاتی یونٹ بن جاتا ہے۔ اور

یوں حمل قرار پاتا ہے —

جسم انسانی چھوٹے چھوٹے خلیات سے مل کر بنتا ہے۔ ایک اوسط قد و قامت کے انسانی جسم میں ان خلیات کی تعداد ایک کروڑ ارب کے قریب بتائی جاتی ہے، ایک ہی خلیے سے یہ تمام اربوں کھربوں خلیے بنتے ہیں، کروڑوں خلیے (CELLS) روزانہ ختم ہوتے رہتے ہیں اور دوسرے خلیے اسی وقت ان کی جگہ لے لیتے ہیں —

اندازہ ہے کہ ہر سیکنڈ میں خون کے دس لاکھ سرخ خلیات ختم ہو جاتے ہیں اور اسی تعداد میں نئے خلیات جنم لیتے ہیں۔ جسم انسانی میں بے شمار انواع و اقسام کے ان کھربوں خلیات کا آپس میں اتنا اشتراک عمل ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنا کام ذمہ داری اور صحت کے ساتھ ادا کرتا ہے ہر خلیہ اپنے فرض منصبی کو جانتا ہے کہ کس طرح اس نے سارے بدن کی بہتری اور اچھائی کے لئے اپنے حصہ کا کام کرنا ہے —

یہ انسانی خلیے ایک فسیل بند شہر کی طرح ہیں اس کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بجلی گھروں کی طرح جنریٹر کام کرتے ہیں۔ اس کی فیکٹریوں میں (بیروٹین) لحمیات تیار ہوتے ہیں۔ اس تیار شدہ سامان یعنی کیمیاوی اجزاء کو جسم کے تمام حصوں میں پہنچانے کے لئے ایک مواصلاتی نظام بھی ہے۔ خطرہ یا گزند پہنچنے پر اس کے سدباب کے لئے فوری اقدامات اور احکام صادر ہوتے ہیں —

خلیے مختلف شکل اور جسامت اور مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، ان میں نازک خلیے بھی ہیں جن کی جسامت ملی میٹر کے۔ لاکھویں حصے کے برابر ہیں پہلے تحقیق ہوا تھا کہ ۷ سال میں اول خلیے ختم ہو کر دوسرے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہر گیارہ مہینے بعد کھربوں خلیوں پر مشتمل یہ پورے کا پورا نظام بدل جاتا ہے —

جسم انسانی کے جملہ عجائبات کا بیان تو ناممکن ہے۔ چند حیران کن حقائق درج ذیل ہیں

آپ کو پڑھ کر تعجب ہوگا کہ انسانی دماغ میں ۲۵ ارب سے زیادہ نیوٹران ہوتے ہیں جو

اپنا کام ہمہ وقت کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ نیند کے دوران بھی ان کا کام بھی اسی طرح جاری رہتا ہے۔ ساری دنیا کا ٹیلیفون نظام بھی اس کے برابر کام نہیں کر سکتا، ذرا آگے بڑھئے اور قلوب کو دیکھئے جو خود تو چھوٹا سا ہوتا ہے یعنی اندازاً نصف پونڈ کے برابر لیکن اس میں دو پمپ ہوتے ہیں ایک پھیپھڑوں کو خون کی ترسیل کے لئے تاکہ وہاں سے آکسیجن جذب کر سکے، دوسرا صاف شدہ خون کو سارے بدن میں دوڑانے کے لئے ایک آدمی کی اوسط زندگی میں دل ۳ لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ یہ اپنی بجلی بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ایک آدمی ستر سال زندہ رہے تو دل ۴ کھرب دفعہ دھڑکتا ہے۔

اسی طرح ایک آدمی کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے ۵ کروڑ مرتبہ پھولتے اور سکڑتے ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی کوئی مشین نہ ایسی مشقت برداست کر سکتی ہے اور نہ ہی بغیر مرمت اتنے لمبے عرصے تک اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے۔ علیٰ هذا القیاس ایک انسانی آنکھ میں ایک کھرب سے زیادہ روشنی قبول کرنے والے ریشے ہوتے ہیں۔ یہ تعداد ان ستاروں کے برابر ہے جو ہلکی وے نامی کہکشاں میں ہیں، انسانی بدن میں خون کی شریانوں کو اگر تپا پائے تو ان کی لمبائی ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ میل لمبی ریلوے لائن کے برابر نکلتی گی۔

انسانی جسم ۳ کروڑ کیمیائی اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ ان اعداد و شمار پر مشتمل اجزاء کو لفظوں میں لکھنا چاہیں تو اس سے دس ہزار ضخیم کتابوں کی ایک لائبریری بن جائے گی۔



نظام کائنات میں

رزق کا انتظام

اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس کی ہر تخلیق حکمت کا شاہکار ہے اس کی بے پایاں رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ انسان اس کائنات کی مرکزی شخصیت ہے جس کو اس کے خالق نے اعلیٰ صلاحیتیں دے کر اس بھری دنیا میں بھیجا ہے اور اس کی ضروریات کی فراہمی کا پورا پورا انتظام بھی کیا ہے۔ ہر آن اس کی ضروریات کی فراہمی پر اتنی طاقتیں لگی ہوئی ہیں کہ بے چارے انسان کو اس کی خبر بھی نہیں۔ زمین اپنے اندر ایک عظیم خزانہ رکھے ہوئے ہے جو برابر انسان کے کام آ رہا ہے۔

آسمان سے رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ ہزاروں چیزیں بالواسطہ اور بلاواسطہ ایک کی خدمت پر مامور ہیں جس کا انسان کو احساس بھی نہیں ہے۔

گیہوں ہماری غذا کا ایک معروف جز لیکن کم ہی لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ گیہوں کا ایک دانہ کسے تیار ہوتا ہے اس کی تیاری میں کتنی قوتیں لگی ہوئی ہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر گیہوں کا دانہ پتھر پر پھینک دیا جائے تو اس سے گیہوں کا ایک پودا بھی نہیں اُگ سکتا گیہوں کا پودا تیار ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ زمین کا اوپری حصہ ٹوٹ پھوٹ کر نرم

مٹی کی شکل میں تبدیل ہو جائے تناس کا ہر طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ ٹھوس چٹان ویڈرنگ (WEATHERING) اور ڈینوڈیشن (DENUDATION) کے بغیر زم مٹی کی شکل اختیار نہیں کر سکتی لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ اس توڑ پھوڑ کے کام میں کتنے عوامل مثلاً گرمی سردی بہتا ہوا پانی ہوا وغیرہ مل کر کام کرتے ہیں تب کہیں زمین کی سطح پر نرم مٹی کے میدان بنتے ہیں جہاں گیہوں کی فصل لہلہاتی ہے لیکن گیہوں کے اُگنے کیلئے صرف مٹی ہی تو کافی نہیں ہے اس کو نمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے —

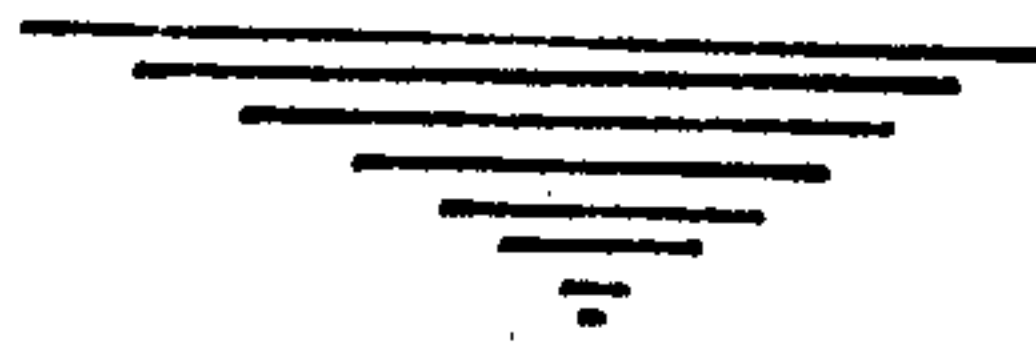
چنانچہ ہماری زمین کا ۱ فیصد حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے ذخیروں کے علاوہ بحر اٹلانٹک (ATLANTIC OCEAN) بحر پیسفک (PACIFIC OCEAN) اور بحر ہند (INDIAN OCEAN) تین بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ یہ سمندر اتنے گہرے ہیں کہ ساری خشکی کا علاقہ اس میں ڈبو یا جاسکتا ہے۔ پیسفک تو اتنا گہرا ہے کہ اس میں ہمالیہ کا پہاڑ ڈبو یا جائے تو اس کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ (EVEREST) جس کی اونچائی ۸۸۴۸ میٹر ہے پانی میں بالکل غائب ہو جائے لیکن گیہوں کی فصل تیار ہونے کے لئے اصل مسئلہ پانی کی موجودگی نہیں ہے بلکہ پانی کا ان ذخیروں سے نکل کر ہمارے کھیتوں تک پہنچنا ہے چنانچہ سورج کی کرنوں میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ سمندر کے پانی کو خاموش طریقہ سے بھاپ میں تبدیل کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح ہونے والے اربوں ٹن پانی اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ اب بھی حل طلب ہی ہے کہ پانی سے لدی ہوئی ہوا ہمارے کھیتوں تک کیسے پہنچے — ہوا کے چلنے کے لئے زمین کی سطح پر ہوا کے کم دباؤ (PRESSURE - LOW) اور ہوا کے زیادہ دباؤ (HIGH PRESSURE) والے خطوں کا بننا ضروری ہے چنانچہ مطلوبہ دباؤ پیدا کرنے کے لئے ہماری زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گھوم رہی ہے۔ اس گھماؤ کی وجہ سے مطلوبہ دباؤ تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن ساتھ

ایک دوسرا خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ زمین کی تیز رفتاری کی وجہ سے کہیں انسان اُلٹ پلٹ نہ ہو جائے۔ چنانچہ زمین کی سطح پر بڑے بڑے پہاڑ ہمالیہ راکیز، اینڈیز اور آپس کی شکل میں نصب کر دیئے گئے تاکہ زمین میں توازن قائم ہو جائے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو سائنس میں (ISOSTASY) کہتے ہیں —
 اتنی قوتیں تو مٹی اور پانی مہیا کرنے پر لگی ہوئی ہیں۔ ابھی گہروں کی فصل تیار ہونے تک بہت سے مراحل باقی ہیں اس کو آکسیجن (OXYGEN) نائٹروجن (NITROGEN) کاربن ڈائی آکسائیڈ (CARBON DIOXIDE) وغیرہ گیسوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کو بہت سی معدنیات چاہیئے۔ یہ پودا مستقل دھوپ برداشت کر سکتا ہے اور نہ مستقلاً اندھیرے میں زندہ رہ سکتا ہے، اسی لئے رات اور دن کا نظام بنایا گیا تاکہ دن میں روشنی اور گرمی ہے اور رات میں خفگی حاصل کرتا ہے۔

ہمارے خالق نے جب ایک دانہ گہروں تیار کرنے میں اتنی قوتیں ہماری خدمت پر لگا رکھی ہیں تو ہماری لمبی چوڑی ضروریات کی فراہمی پر کتنی قوتیں لگی ہوئی ہوں گی —



محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

قرآن کریم کے اس خوشنما بیان کی وضاحت کی جاتی ہے جس میں آپ دیکھیں گے کہ مکھوں کے نظام میں کس طرح ہر ایک مکھی جو کام اس کے سپرد ہے حسن و خوبی سے سرانجام دیتی ہے اور پھر تمام مکھیاں اپنی محنت کے ما حاصل کو اپنے مشترکہ بیت المال میں جمع کر دیتی ہیں اور وہاں سے ہر ایک کو اپنی ضرورت کے مطابق سامان نشوونما ملتا رہتا ہے۔ اور کس طرح ہر موسم کے مطابق معیشت کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور ملکہ مکھی صرف اتنے انڈے دیتی ہے جس قدر کہ ورکرز کی ضرورت ہو اور کس حسن و خوبی سے ورکرز کے اندر لبر کی تقسیم ہوتی ہے اور کس طرح سردی کے موسم میں نہ مکھے جو بیکار ہوتے ہیں، ان کو سوسائٹی سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کی تنظیم | شہد کی مکھی قدرتی طور پر درختوں پر اور پہاڑوں کی خالی جگہوں میں اپنے چھتے

بناتی ہے۔ محو اب انسان نے خود ان کو پالنا شروع کر دیا ہے۔ چھتے کے اندر □
(VERTICLE) عمودی کو ٹھڑیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بعض کو ٹھڑیاں □
(LATERAL) یا بغلی بھی ہوتی ہیں جو کہ شہد اور زیرہ جمع کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ زیرہ یا پھل پھول کا بور یا سفوف مکھیوں کی خوراک ہے۔ جو وہ پھولوں سے جمع کرتی ہیں۔ یہ چھتے کی تعمیر بھی حیران کن ہے کہ شہد ایک عمودی کو ٹھڑی میں نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ اس کے ذخیرے کے لئے بغلی کو ٹھڑیاں بنائی جاتی ہیں۔

شہد کے عام چھتے کے اندر قریباً ۶۵۰۰۰ مکھیاں آباد ہوتی ہیں۔ جس کے تین درجات ہیں۔ ان میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے۔ جو اس کا لونیہ آباد تمام مکھیوں کی ماں ہے۔ چند ہزار نہ مکھے (POLLEN) ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام کارکن مکھی بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ ملکہ اور نہ مکھے اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں ملکہ انڈے دیتی ہے اور نہ مکھے جو نئی ملکہ پیدا ہوتی ہیں ان کو بار آور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھتے کا

تمام کام اور باہر اندر کی تک و دو کارکن مکھیاں کے ذمے ہوتی ہے جو پیدائش کے لحاظ مادہ ہوتی ہیں لیکن آگے اولاد پیدا کرنے والے اعضاء ان میں موجود نہیں ہوتے یا ان کے صرف باقیات ہوتے ہیں، اس لئے وہ انڈے نہیں دیتیں اور تمام دن پانی فراہم کرنے پھولوں کا رس اور (POLLEN) زیرہ اکٹھا کرنے، موم پیدا کرنے، چھتہ تعمیر کرنے، تمام درجات کے لئے خوراک مہیا کرنے، ملکہ کی خدمت کرنے، انڈوں سے نکلنے والے نئے بچوں کو پالنے، چھتے کو صاف ستھرا رکھتے اور باہر سے دشمن کی جارحیت کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ درختوں کی کونسلوں سے (RESIN) رال گوند سمیٹ کر لاتی ہیں اور چھتے میں جو درزیں موجود ہوتی ہیں ان کو اس مخزلیے بند کرتی ہیں تاکہ پانی یا ہوا اندر داخل نہ ہو سکے، قدرت نے ان کے اندر ڈنگ رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ چھتے کی حفاظت کر سکیں اور شہد کو دوسرے حیوانات کی چوری سے بچا سکیں۔

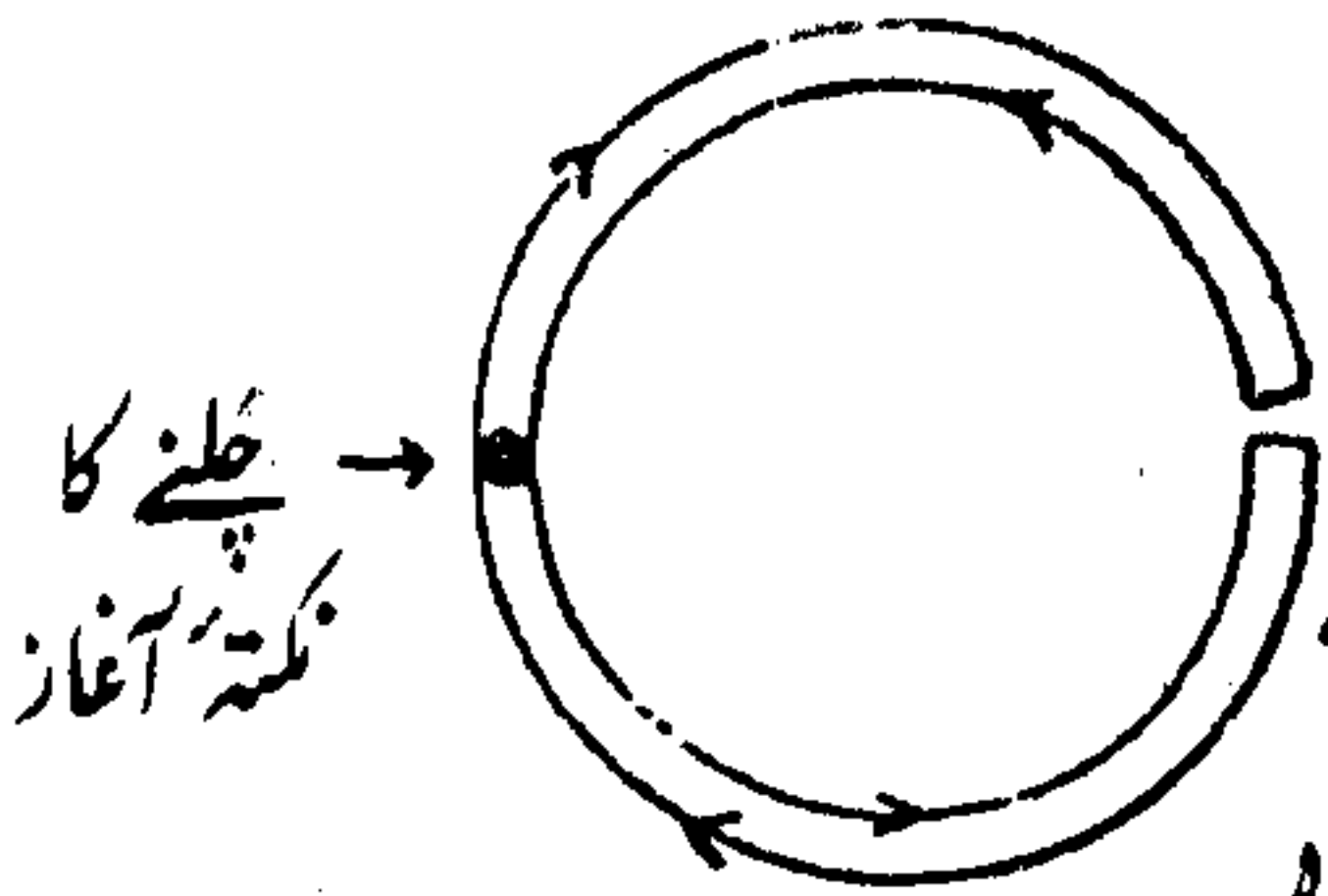
جب موسم بہار میں موسم گرم ہونا شروع ہوتا ہے اور پھول نکلنے شروع ہوتے ہیں ہیں تو کارکن مکھیاں پھولوں کا رس اور زیرہ اکٹھا کرتی ہیں ملکہ تیزی کے ساتھ انڈے دینا شروع کرتی ہے اور انڈوں سے نکلنے والے بچوں سے چھتے کی آبادی بے حد بڑھ جاتی ہے آبادی بڑھ جانے سے مکھیاں غول کی شکل میں چھتے سے اڑ جاتی ہیں جس کے لئے

(SWARMING) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، ملکہ، بمعہ چند ہزار مکھیاں ایک غول کی شکل میں اڑ کر یا تو عارضی طور پر کسی درخت پر جا بیٹھتی ہیں یا کسی نئی جگہ پر جا کر آباد ہو جاتی ہیں جن کا سروے پہلے سکاؤٹ کارکن مکھیاں کر چکی ہوتی ہیں۔ پرانے چھتے میں جو کارکن سے مکھیاں باقی رہ جاتی ہیں وہ پہلی اڑ جانے والی ملکہ کے انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں جن سے نئی ملکہ پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو ملکہ سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے، وہ باقی تمام انڈوں بچوں کو اپنے ڈنگ سے ضائع کر دیتی ہیں۔ اگر بیک وقت دو نئی ملکہ پیدا ہو جائیں تو دونوں کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک ماری جاتی ہے اور دوسری فاتح ہو کر نئی جماعت کو

کنٹرول کرتی ہے۔۔۔ نئی ملکہ کی پیدائش سے تقریباً ایک ہفتہ بعد ایک نر مکھا —
 (DRONE) ملکہ کو بار آور کرتا ہے۔ اور یہ عمل ہوا میں اڑان کے دوران ہوتا ہے۔ جہاں
 دونوں اڑ کر جاتے ہیں۔ نر کا عضو تولید ٹوٹ کر ملکہ کے تولید کے خانے میں رہ جاتا ہے جہاں
 سے کارکن مکھیاں چھتے میں واپس آنے کے بعد اسے کرید کرید کر باہر نکالتی ہیں۔ نر خلیوں کا
 جو ذخیرہ ملکہ کی (SPERMOTHECA) سپرموٹھیکا یعنی نر خلیوں کی تھیلی میں رہ جاتا
 ہے وہ ان تمام انڈوں کو بار آور کرتا رہتا ہے جو کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی پوری عمر میں دیتی ہے۔
 وہ اس بار آوری کے عمل پر کنٹرول رکھتی ہے۔ جو انڈے بار آور نہیں ہوتے ان سے نر مکھے پیدا
 ہوتے ہیں۔ اس قسم کی بغیر باپ کے پیدائش سوشل کیڑوں مکوڑوں میں اور دیگر حیوانات میں
 عام ہے۔ ملکہ کے جو انڈے بار آور ہوتے ہیں ان سے کارکن مادہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں جس
 موسم میں پھولوں میں رس پیدا ہوتا ہے اس موسم میں ملکہ قریباً ایک نہر انڈے روزانہ دیتی
 ہے جو کہ چھتے کی کوٹھڑی کے فرش میں چپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ پہلے دو دن تک تمام
 لاروا کو (ROYAL JELLY) رائل جیلی کھانے کے لئے ملتی ہے۔ کارکن مکھیوں کے
 منہ کے اندر غدودوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس جیلی کے اندر پھولوں اور پھلوں کا بؤرہ شہد
 اور بھاری مقدار میں وٹامن موجود ہوتی ہے۔ اس کے بعد نر مکھوں اور ورکر مکھیوں کے
 لاروا کو صرف شہد اور (POLLEN) پھل پھول کا بؤرہ ملتا ہے۔۔۔

— لیکن وہ لاروا جن سے ملکہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کو رائل جیلی بدستور ملتی رہتی
 ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی نشوونما مختلف طریقے سے ہوتی ہے اور ان کے جسم کا سائز بڑا
 ہو جاتا ہے۔۔۔ ایک اور دلچسپ چیز ملاحظہ فرمائیے۔ اگر ملکہ کے انڈے دینے کی رفتار
 تیز ہو اور چھتے کی کوٹھڑیاں تعمیر کرنے کی رفتار سست ہو تو ملکہ کو کارکن مکھیوں کی طرف سے
 خوراک کم ملتی ہے، اس کے برعکس اگر انڈے دینے کی رفتار سست ہو اور چھتے کی کوٹھڑیاں
 زیادہ بن جائیں تو ملکہ خوراک زیادہ ملتی ہے۔۔۔

خوراک اکٹھی کرنے کی ہم پر کارکن مکھیاں ایسے (POLLEN) پھولوں کے بُوریا سفوف کو اکٹھا کرتی ہیں، جس کے اندر پروٹین اور (NECTAR) پھولوں کا رس زیادہ ہو۔ مکھی کی خوراک کی نالی میں ایک خاص تھیلی ہوتی ہے جس کے اندر رس کو نگل کر ڈال لیا جاتا ہے۔ ایک کارکن مکھی جب باغات میں خوراک کے موقع کو دریافت کر لیتی ہے تو وہ اپنے رس جمع کرنے والے معدہ کو بھرتی ہے اور واپس چھتے میں آ کر یا تو نئی مکھیوں کو کھلا دیتی ہے یا اس کو ذخیرے میں جمع کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک نانچ کرتی ہے، جس کا مقصد اس سمت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں خوراک موجود ہے، تاکہ باقی مکھیاں اس سے آگاہ ہو جائیں۔ یہ نہ صرف خوراک کے موقع کی سمت بتاتی ہیں، بلکہ چھتے سے اس کا فاصلہ بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس رقص میں وہ اپنے جسم کے پچھلے حصے کو (SIDE TO SIDE) ایک طرف سے دوسری طرف حرکت دیتی ہے اور ایک نیم دائرے میں چلتی ہے۔ پھر واپس اسی مقام پر آتی ہے جہاں سے چلی تھی۔ پھر الٹی سمت پر نیم دائرے میں چلتی ہے۔ پھر واپس لوٹتی ہے اور اپنے عمل کو دہرائے جاتی ہے۔



مکھی خوراک کے موقع کی سمت جسم کے ایک خاص جھکاؤ سے ظاہر کرتی ہے اور اس کا چھتے سے فاصلہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکھی ایک مقررہ

وقت میں کتنی مرتبہ واپس مُڑتی ہے (یا پھیرے لیتی ہے) رقص کی شدت ظاہر کرتی ہے کہ خوراک کے موقع پر کس قدر خوراک موجود ہے اور خوراک کی نوعیت کیا ہے وہ اس کے جسم کی بُور سے ظاہر ہوتی ہے جو پھول پر بیٹھتے وقت اس کے جسم کو چھوتی ہے یا اس سے معلوم ہوتی ہے جو وہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ شہد والے معدے میں جو رس موجود ہوتا ہے اس پر اس کے مُرنے کے لعاب میں سے (ENZYMES) خمیر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ گنے کا رس ہو تو وہ (DEXTROSE) ڈیکسٹروس اور (LEVULOSE)

لیووکوس میں بدل جاتا ہے۔ (یہ میٹھے کی قسمیں ہیں) چھتے میں پہنچنے کے بعد مکھی اس رس کو اپنے معدے سے ایک کوٹھڑی کے اندر اُلٹ دیتی ہے، جہاں سے دیگر مکھیاں اسے اپنے منہ میں ڈال کر اس میں دیگر کیمیا کی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ وہ اپنے پردوں کو حرکت دے کر اس کا فالتویانی خشک کرتی ہیں وقتاً فوقتاً وہ اسے چکھ کر دیکھتی ہیں اور جب اس کا قوام درست ہو جائے تو اسے ایک کوٹھڑی میں ڈال کر اس کا منہ موسم سے بند کر دیتی ہیں۔

سمت دریافت کرنے کی قوت

(POWER OF ORIENTATION)

شہد کی مکھیوں اور دوسرے سوشل کیڑوں کی سمت دریافت کرنے کی قوت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ خوراک جمع کرنے کی مہم میں شہد کی مکھی سورج کی روشنی کی شعاع کے ذریعے راستہ دریافت کرتی ہے۔ وہ سورج کی شعاع کے ذریعے اپنے چھتے کی سمت کا حساب رکھتی ہے اور کسی بھی طرف سے چھتے کی طرف واپس آنے کا صحیح اندازہ رکھتی ہے۔

سردی کے موسم میں مکھیاں سردی سے بچاؤ کی خاطر تھوڑی جگہ میں ایک دوسرے کے قریب سمٹ جاتی ہیں۔ اگر چھتے میں دھواں آجائے تو وہ شہد کے ذخیرے کی طرف دوڑتی ہیں اور اسے اپنے اپنے پیٹ میں بھر لیتی ہیں، خوراک کی کمی سے بچاؤ کی خاطر موسم سرما کے آغاز میں زرخٹوں کو چھتے سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ تمام حرکات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مکھی کے اندر (INTELLECT) دانائی موجود ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ تمام اعمال جلی طور پر سرزد ہوتے ہیں جسے قرآن وحی کہتا ہے۔

(مظاہر فطرت اور قرآن)

اللہ سے اتنی دُوری کیوں؟

اللہ تعالیٰ ہم سے جتنا زیادہ قریب کے بد عملی کی وجہ سے ہم اُس سے زیادہ دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ جناب صدر الدین شیرازی فرماتے ہیں: —

”تمام چیزوں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ ہم سے قریب تر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی ہماری ذاتوں سے جتنا قُرب خدا کی ذات کو ہے۔ دوسری کسی چیز کو اتنی نزدیکی کی نسبت حاصل نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ہم لوگوں کو اسی لئے پیدا فرمایا اور اسی لئے ہماری ہدایت فرمائی کہ ہم اس کی معرفت حاصل کریں اور اچھے بندوں کے اعزاز و اکرام کا جو مقام اس نے مقرر فرمایا ہے۔ وہ مقام ہم بھی حاصل کر سکیں تاکہ حضرت الہی کا قُرب ہمیں میسر آئے۔ اسی مقصد کے لئے پیغمبروں کو مبعوث کیا گیا اور کتابیں آسمان سے نازل ہوئیں۔ یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے یہ سارا نظام اس لئے قائم نہیں کیا گیا کہ جو چیزیں خدا سے دُور اور بعید ہیں ان سب کے مقابلے میں ہم ہی سب سے دُور ہو جائیں اور چتنے بد بخت نفوس حیرت و شک کے میدان میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں ہم ہی سب سے زیادہ بد بخت قرار پائیں —

(اسفار اربعہ)

وُجُودِ باری تعالیٰ کی تشکیکات کا جواب

سُرخ طاس جو فلسفہ الہیات کے ہوشیار و متکلم ہیں، وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات میں ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ اگر انہیں بصیرت کے ساتھ سمجھ لیا جائے تو دہریت

اور بشر کیہ تشکیکات ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی ہیں، آپ لکھتے ہیں:۔

خُذل کے وجود کا اثبات پانچ طریقوں سے کیا جاسکتا ہے،

۱۔ پہلی اور واضح تر دلیل حرکت کی بنیاد پر پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض چیزیں متحرک ہیں اور یہ حرکت کسی اور وجود کے باعث ظاہر ہوتی ہے۔ حرکت کا عمل اسی بالقوۃ صلاحیت کو بالفعل شکل میں تبدیل کر دینے کا نام ہے لیکن کسی شے کا بالقوۃ حالت میں تبدیل ہونا بھی ممکن ہے کہ کوئی دوسری شے بالفعل حالت میں اس سے پہلے موجود ہو، مثلاً آگ جو بالفعل گرم ہے لکڑی کو جو بالقوۃ گرم نہیں ہے گرم کر دیتی ہے اور اس طرح بالقوۃ حالت بالفعل حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی نقطہ نگاہ سے ایک وقت میں ایک شے بالفعل بھی ہو اور بالقوۃ بھی۔ اگرچہ مختلف زاویوں سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ شے جو بالفعل گرم ہے اسی وقت بالقوۃ گرم نہیں ہو سکتی، لیکن ہم اسے بالقوۃ سرد کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ایک ہی طریقے سے ایک شے متحرک بھی ہو، محرک بھی ہو۔ یعنی وہ خود اپنی حرکت کا باعث بھی ہو۔ پس اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ جو شے بھی متحرک ہے وہ کسی دوسری شے کے زیر اثر حرکت میں ہے۔ اگر محرک خود متحرک ہے تو لازمی طور پر اس کی حرکت

۵ فعلیت کا لفظ قوت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ قوت سے مراد کسی شے

کی صلاحیت اور استعداد ہوتی ہے۔ مثلاً تخم میں درخت بن جانے کی قوت ہے۔ یعنی

اس کی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ درخت بن جائے۔ اسی طرح تخم جب درخت

کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی قوت نے فعلیت کا رنگ اختیار کر لیا۔

کمی اور وجود کے باعث ہے اور علیٰ هذا القیاس یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی محرک اولیٰ نہیں ہوگا اور محرک بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعد کے محرک اسی صورت میں متحرک ہوتے ہیں جب پہلا محرک انہیں حرکت میں لاتا ہے، مثلاً چھڑی اُس وقت حرکت کرتی ہے جب ہاتھ اُسے متحرک کرتا ہے۔ اسی طرح ہم محرک اول تک جا پہنچتے ہیں جسے کسی دوسرے نے متحرک نہیں کیا اور یہی خدا ہے۔

۲۔ دوسری دلیل علتِ فاعلیٰ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے محسوسات کی دنیا میں علتِ فاعلیٰ کی ایک ترتیب ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی شے موجود نہیں (اور یہ ناممکن ہے جو خود اپنے وجود کی علتِ فاعلیٰ ہو، اگر ایسا ہو تو وہ اپنے آپ سے مقدم ہوگی جو ناممکن ہے عللِ فاعلیٰ کا سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس سلسلہ میں پہلا وسطیٰ علت کی علت ہوتا ہے اور وسطیٰ، آخری کی علت، خواہ وسطیٰ علت کثیر ہو یا واحد، اگر علت نہ ہو تو معلول بھی غائب ہوگا۔ پس اگر عللِ فاعلیٰ کے سلسلے میں پہلی علت موجود نہیں تو نہ کوئی وسطیٰ علت ہوگی اور نہ آخری۔ اگر لامتناہی سلسلہ ممکن ہو تو نہ کوئی پہلی علت فاعلیٰ ہوگی اور نہ عللِ وسطیٰ اور اسی طرح آخری معلول بھی نہ ہوگا۔ او یہ سب بظاہر بے معنی ہے اس لئے ہم مجبور ہیں کہ کسی پہلی علتِ فاعلیٰ کو تسلیم کریں

۱۵۔ اس کی مختصر فقہیم یہ ہے کہ ہم اشیاء کو متحرک دیکھتے ہیں۔ کوئی شے خود بخود متحرک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی حرکت کا اصل سبب کوئی خارجی قوت ہے اگر وہ دوسری شے خود متحرک ہے تو اس کی حرکت کی علت کوئی تیسری شے ہوگی جو ان دونوں سے مختلف ہوگی۔ — تحریک کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی محرک اول ضرور ہوگا جو اپنی ذات میں غیر متحرک ہے اور وہی اس دنیا کی ہر حرکت کی علتِ اولیٰ ہے اس کے بغیر حرکت کا وجود ممکن ہی نہیں چونکہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اس لئے ایک محرک اولیٰ کا وجود ناگزیر ہے — اور یہی خدا ہے —

اور یہی خدا ہے —

۳ — تیسری دلیل امکان ہے اور وجوب سے تعلق رکھتی ہے۔ محسوسات کی دنیا کی ہر شے موجود بھی ہے اور معدوم بھی۔ ہر شے پیدا ہوتی ہے اور پھر درجہ تکمیل تک پہنچ کر زوال پذیر ہو جاتی ہے اور اسی طرح معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کا ہمیشہ موجود رہنا ناممکن ہے کیونکہ وہ شے جو ایک معدوم ہو جاتی ہے ضرور اپنے موجود ہونے سے پہلے بھی معدوم ہو گی، پس جب شے معدوم ہو سکتی ہے تو پھر ناممکن ہے کہ ایک ایسا وقت بھی ہو جب کوئی چیز موجود نہ ہو۔

اگر یہ صحیح ہے تو پھر اُس وقت بھی کوئی شے موجود نہ ہو گی۔ کیونکہ جو چیز معدوم ہے وہ صرف ایک موجود شے کے باعث موجود ہو سکتی ہے۔ پس اگر کسی وقت کوئی شے موجود نہ تھی تو کسی شے کا وجود میں آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی رو سے آج بھی کوئی شے موجود نہیں ہو گی، جو ظاہراً لایعنی ہے۔ اس لئے ہر چیز ناممکن الوجود نہیں۔ ایسا کوئی وجود ضرور ہے جو اپنی ذات سے واجب ہے۔ ہر واجب شے کا وجوب یا تو کسی غیر کے باعث ہے یا اپنی ذات کے باعث۔

اگر وجوب کی علت کوئی دوسری شے ہے تو یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا پس ہم کسی ایسے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جس کا وجوب اس کی اپنی ذات کے باعث ہے، جو واجب الوجود ہے اور یہی خدا ہے —

۴ — چوتھی دلیل اشیاء کے مراتب وجود پر مبنی ہے۔ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ یہ آدمی کم یا زیادہ نیک، شریف، رحم دل ہے۔ ”کم“ اور ”زیادہ“ کا استعمال کسی نہ کسی معیار کو سامنے رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ شے بہت گرم ہے تو ہمارے نزدیک ”گرم ترین“ کا تصور پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی شے ضرور ہے جس میں نیکی، شرافت اور رحم دلی، ایک نصب العین

حالت میں پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ شے بہترین وجود کی بھی حامل ہوگی، کیونکہ جہاں صفات کی انتہائی بلندی ہوگی، وہاں موجود کی صفت کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ جو شے نخی جنس میں سب سے زیادہ مکمل شکل میں موجود ہوگی وہ اس جنس کی ہر شے کی علت ہوگی۔ مثلاً آگ جو گرمی کی کامل ترین شکل ہے۔ ہر جگہ گرمی کی علت ہے۔ اس طرح اس کائنات کی ہر شے کے وجود اور کمال کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے اور اس کو ہم خدا کہتے ہیں۔

۵۔ پانچویں دلیل اس دنیا کے نظام پر مبنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مادی اشیا جو عقل و منطق سے عاری ہیں کسی مقصد کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا چلن تقریباً یکساں ہوتا ہے، اس لئے ہم ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی کہ اس طرح ان سے استفادہ کیا جائے، ہر مادی شے جو عقل سے عاری ہے اس سے فائدہ وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو عقل و فہم سے آراستہ ہے۔ مثلاً تیر صرف تیر انداز ہی کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی ذات ایسی حکیم اور ایسی علیم ضرور ہے جس نے کائنات کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا اور اس ذات کو ہم خدا کہتے ہیں۔

(فلسفہ مذہب ص ۱۱۱)



خُدا کا بگڑا ہوا تصوّر!

باطل مذاہب میں خُدا کا جو بگڑا ہوا تصوّر پایا جاتا ہے، وہ انسان کی طلب کا مکمل جواب نہیں بنتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیات ایک کامل خُدا کی طالب ہے۔ اور یہ مذاہب اس کو ناقص خُدا کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان بنا پر اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ اندرونی طلب سے مجبور ہو کر بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑتے ہیں، مگر اُن کی حقیقی روحانی تسکین اُسی خُدا سے ہو سکتی ہے جس کا تصوّر اسلام نے پیش کیا ہے۔ ایک شخص اپنی سواری کے لئے موٹر کار کا طالب ہو تو آپ اُس کو کھلونا گاڑی دے کر مطمئن نہیں کر سکتے، اس کا اطمینان تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اُس کو ایک اصلی کار مل جائے، اس لئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَهْتَفُونَ الْقُلُوبَ

سُنو! خُدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

خُدا اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر اس کی تخلیق ایک عظیم کائنات کی صورت میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن کسی ایسے خُدا پر ہی مطمئن ہو سکتا ہے جو موجود کائنات کے شایانِ شان ہو۔ جو آدمی کو واقعی اس عظیم کائنات کا خالق دکھائی دے۔ اس سے کم تر درجہ کا خُدا، انسان کے ذہن کو اپیل نہیں کر سکتا۔

ایک امریکی سائنس دان والٹر اسکراٹنڈ برگ نے اس کی ایک دلچسپ مثال دی ہے: وہ لکھتے ہیں: —

”ایک سائنس دان دوسروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی توقع اس بات کی رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچائی کو سمجھ سکے، وہ اساسی اصول جس پر اُس کے کام کی بنیاد ہے وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار ہے۔“ اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں —

امریکی پروفیسر کے نزدیک دُویں سے ایک خالی سبب اس کا یہ ہے منظم مسحت میں نوجوانوں کے اندر گہرائی کے ساتھ ایک ایسے خدا کا عقیدہ پیوست ہے جو انسانی صورت میں پیدا ہوا۔ اس طرح کے ذہن بعد میں جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو خدا کا یہ اُلٹا اور محدود تصور دھیرے دھیرے غیر عقلی اور غیر علمی معلوم ہونے لگتا ہے، بالآخر جب مطابقت پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو اس کے بعد خدا کا یہ تصور مکمل طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے —

(اسلام اور عصر حاضر ص ۱۱۹ از مولانا وحید الدین خان)

مادی تمدن کی شکست اور خدا کی ضرورت

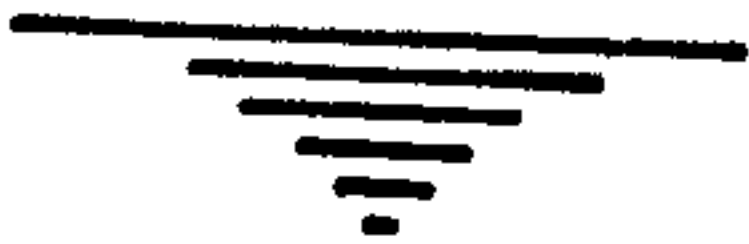
تاریخ انسانی کے مشہور عالمی مؤرخ ٹائن بی تہزیب حاضر کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: —

”عصر جدید کے انسان کا حال اُس ہارے ہوئے جُواری کی طرح ہے جس نے

افتح حاصل کرنے کے لئے اپنے تمام داؤ پیچ قمار بازی میں لگا دیئے ہوں۔ یہاں تک کہ تمام دولت اور اپنی زندگی کی بازی بھی لگا دی ہو تاکہ وہ کامیابی حاصل کر سکے۔ مگر اس کے باوجود اُسے اپنی تدابیر (کے کامیاب ہونے پر) بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ تاریخ عالم کے مکمل مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دنیاوی کامیابی انجام کار سب سے بڑی ناکامی بنتی ہے، قوموں کی تہذیب و تمدن کو صرف اُسی وقت صحیح اور مکمل کہا جاسکتا ہے، جب تک اس میں تحقیق کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ —

صنعتی انقلاب کے دور میں سائنس کی ترقی نے اُس زمانے کے حالات کے مطابق بڑا تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنے زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کی کافی تکمیل کی ہے مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مسائل ہمیں درپیش ہیں سائنس کی تجربہ گاہوں کے ذریعے ان کو حل کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے کیونکہ ہمارے موجودہ مسائل اخلاقی نوعیت کے ہیں جنہیں سائنس قطعاً حل نہیں کر سکتی بلکہ دیگر مادی تدابیر سے بھی انہیں حل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور خدا کے تقوٰ کے بغیر معاشی اور سماجی اغراض کا علاج کرنے کے نقصانات ہم پر اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں۔ اس لئے دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک مافوق الفطرت ہستی (خدائے بزرگ و برتر) پر ایمان لانے کے جذبے کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ —

(موجودہ انسان کو تاریخ کی تنبیہ سے — از طائفہ بی)



مادہ کے قدیم ہونے کا رد اور خدا کا ثبوت

جناب محمد زکی کامل اکبر آبادی لکھتے ہیں:۔

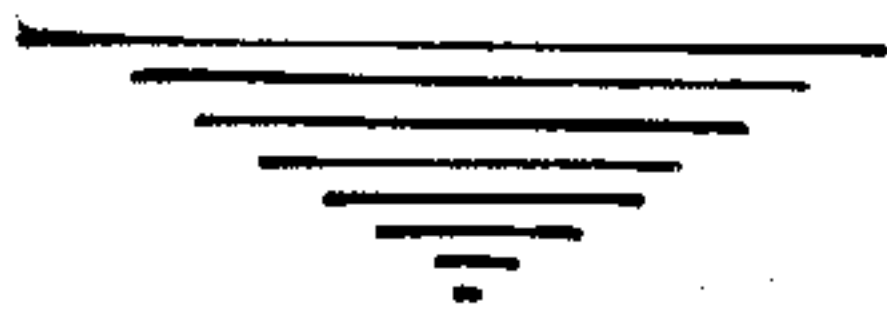
فلاسفہ قدیم و خطاب کو قدامت کے مادہ کے سرزبردستی منڈھتے ہیں۔
ذٰلک قولہم با فواہم مادہ صور نوعیہ یا صور جسمیہ کے مقابل ایک ناقص
ہے، صور نوعیہ یا جسمیہ سے پیشتر مادہ کی ضرورت تھی جو صور نوعیہ و جسمیہ پر
پہنچنے کے بعد جاتی رہی اور تصریحی تغیر ہے اور جو متغیر ہے لازماً وہ حادث ہے ہر کب
متغیر ہوتا ہے۔ پس مادہ بھی جو اجزا سے مرکب ہے متغیر ثابت ہوا، اور جو متغیر
ہے وہ حادث ہے، سائنس دان کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے مادہ ہے اور اس کی حرکت
ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تو لا محالہ مادہ یا فاعل ہو گا یا منفعل۔ اور حرکت بھی۔

مگر مادہ کو فلاسفہ قدیم و جدید دونوں منفعل مانتے ہیں۔ پھر اس کا فاعل کون
ہو گا؟ حرکت کو فاعل نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ تو ایک عرض ہے جو اپنے (مادے
کے) ساتھ قائم ہے اور خود ہی مفعول اور سر اسر علم ہے۔ پس بالضرورت تسلیم کرنا پڑتا
ہے کہ مادہ کا فاعل کوئی اور ہے اور وہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت اور ماہیت ایسی
کامل و اقصیت رکھتا ہے جو بجز صالح اور کسی کو نہیں ہو سکتی۔

یورپ کا مشہور و معروف فلاسفر نیوٹن لکھتا ہے کہ کواکب کی حرکات
باریہ ممکن نہیں کہ محض عام قوتِ جاذبہ (گریوٹی) کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوتِ جاذبہ

تو کواکب کو سورج کی سمت دھکیلتی ہے، اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کہ کوئی خدائی ہاتھ ہو، جو باوجود قوتِ جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مداروں پر قائم رکھ سکے، کوئی سبب طبعی ایسا نہیں بتلایا جاسکتا ہے جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مداروں پر اور ایک خاص جہت میں حرکت کیا کریں۔ جس میں کبھی تخلف نہ ہو، پھر کواکب کی حرکات اور سرعتِ رفتار میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عینق توازن رکھا گیا ہے، کوئی سبب طبعی نہیں ہو سکتا، جس سے ہم ان منظم اور محفوظ قوانین (قاعدوں قانون) کو وابستہ کر سکیں، ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرامِ سماوی کے مواد اور ان کے خواص سے پورا پورا واقف ہے اور ان پر پوری طرح تسلط در ہے اور اس کی قدرت اس کے لئے نظامِ عالم کی مشینری چلا رہی ہے۔

(صداقتِ سلام ص ۹)



تصادف کے قانون

آخرت کا اثبات

شرآن میں ہے: —

(ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے) — آج سائنس اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہر چیز اپنا ایک ضد (ANTI) رکھتی ہے خود اس کا وجود اسی اینٹی کے بغیر ناممکن ہے —

۱۹۳۲ء میں (K. ANDERSON) نے کاسمک ریز (COSMIC RAYS) کے اندر (ANTI ELECTRON) (الیکٹران کی ضد) کا پتہ لگالیا اور اس کا نام پازیٹران (POSITRON) رکھا۔ یہ پہلا اینٹی پارٹیکل (ANTI PARTICLE) بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح اینٹی پارٹیکل کو تسلیم کرتے ہی فطرتاً سائنسدانوں کی توجہ اینٹی نیوکلئس (ANTI NUCLEUS) اور اینٹی ایٹم کی طرف مڑ گئی۔ ۱۹۳۳ء میں ڈیراک (DIRAC) نے اپنی ایک تقریر میں اینٹی ورلڈ (ANTI WORLD) کے امکان کا ذکر کیا تھا۔ او اس طرح اینٹی میٹر (ANTI MATTER) اور اینٹی ورلڈ کی بات چل پڑی۔ چونکہ ہر چیز اپنا ایک اینٹی (ضد) رکھتی ہے۔ اس لئے دنیا کا بھی ایک اینٹی (ضد) ہونا چاہیے۔ آج

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ (ANTI WORLD) ہماری دنیا کے متوازی، ایک حقیقی وجود رکھتی ہے۔ اور ڈیراک (DIRAC) کے نظریہ کے مطابق ایک اینٹی ورلڈ کا وجود ضروری ہے۔

ڈاکٹر نان (DR. NAAN) کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ کا بیان طبعی سائنس (PHYSICAL SCIENCE) کے اصولوں اور بنیادوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو یقین ہے کہ وہ دنیا آج بھی موجود ہے۔ لیکن وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے (J.S. HALDANE) کا کہنا ہے:۔

”اس بات کے ماننے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہے کہ اس طبعی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے۔“

(PHILOSOPHICAL BASIS of BIOLOGY PAGE 38)

(MAX PLANCK) نے اپنی کتاب:

(UNIVERS IN THE LIGHT OF MODERN PHYSICS)

میں لکھا ہے:۔

”اس مشاہدہ کی دنیا کے علاوہ ایک حقیقی دنیا بھی ہے۔ جو

انسان کے علم اور تصورات کے ماتحت نہیں ہے۔“

(A.S. ADDINGTON) نے بھی اسی قسم کا خیال اپنی کتاب (WORLD -

SCIENCE AND THE UNSEEN) کے صفحہ ۳۳ پر ظاہر کیا ہے۔

سائنسدانوں کے خیالات صاف بتا رہے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف آخرت کو تسلیم کر لیا ہے

بلکہ انہیں پورا یقین ہے کہ وہ آخرت آج بھی موجود ہے۔ وہاں کے حالات یہاں کے

حالات کی ضد ہیں۔ یہاں کی ہر چیز عارضی ہے۔ اور وہاں کی ہر چیز مستقل، یہاں کی ہر چیز

بے قرار (UNSTABLE) ہے جبکہ دوسری دنیا کی ہر چیز کو ابدی قرار (STABLE)

سائنسدانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ممکن ہے کہ دوسری دنیا کی روشنی ہم تک برابر پہنچ رہی ہو لیکن چونکہ دونوں روشنیوں کو ہم اب تک الگ نہیں کر سکے۔ اس لئے وہ دوسری دنیا ہم کو دکھلائی نہیں دیتی۔ دوسری دنیا کے جاننے میں نیوٹرائینو (NEUTRINO) سے مدد مل سکتی ہے۔ لیکن نیوٹران اور اینٹی نیوٹرائینو کو ایک لمحہ کے لئے بھی قرار نہیں ہے، اس لئے ان کا پکڑ لینا ذرا مشکل ہے۔ بہر حال اب آخرت کا تصور کوئی غیر سائنسی (UN-SCIENTIFIC) تصور نہیں رہا —

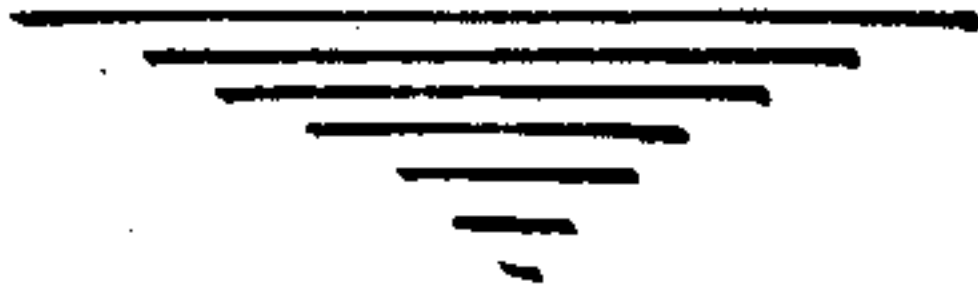
آخرت کا عقیدہ سارے مذاہب کا بنیادی عقیدہ ہے۔ سائنسی دنیا بھی اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ پھر بھی جب انسان سوچتا ہے کہ جب آدمی مر گیا اس کا گوشت اور چمڑا سڑ گل گیا۔ کچھ پانی بن کر بہہ گیا، کچھ کیسوں میں تبدیل ہو کر ہوا میں مل گیا۔ ہڈی تک بوسیدہ ہو کر زمین میں مل گئی تو وہی شخص دوبارہ مع اپنے جسم کے یکے زندہ کیا جائے گا؟ ذہن کسی طرح اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دور میں سب سے زیادہ اچھٹا اس نظریہ پر ہوا ہے اور لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو ایک انہونی بات ہے۔ اس لئے بار بار سوال اٹھتا ہے کہ کیا آخرت ممکن بھی ہے؟ چنانچہ اس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: —

” کیا ہم پہلی بار تخلیق سے عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف

سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (سورۃ ”ق“ آیت ۵۱)

جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اس منظم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے۔ اس کے لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اب یہ امر واقعہ کہ ہم اس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے

سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا۔ اور موت کے بعد وہ بھی دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب پہلے پیدا کر چکا اور اسی تخلیق کی بدولت ہم وجود میں آئے ہوئے ہیں۔ تو یہ فرض کر لینے کے لئے آخر کیا محقول بنیاد ہو سکتی ہے کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنادینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔ بلکہ وہ چاہے تو اس کائنات کو ہزاروں مرتبہ توڑ پھوڑ کر دوبارہ بنا سکتا ہے — وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ —



حادثوں کا نظریہ ارتقاء

دھڑکتے ہوئے بنیادی سبب!

کارل مارکس کا خیال ہے کہ دنیا میں نہ خدا ہے نہ رُوح۔ کائنات کی حقیقت فقط مادہ ہے جو ارتقاء کرتے کرتے انسان تک پہنچا ہے۔ انسانی مرحلہ پر پہنچنے کے بعد کائنات کے ارتقاء نے انسانی سماج کے اقتصادی یا معاشی حالات ارتقاء کی صورت اختیار کی ہے، نفس انسانی فقط مادہ کی ایک خاص ترکیب و ترتیب اور ایک خاص ترقی یافتہ صورت کا نام ہے۔ انسان، مادہ کی بنی ہوئی ایک کل ہے جس کو روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری مادی اشیاء کی ضرورت ہے، جب اس کی یہ ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ ذہنی طور پر ان کی کمی پوری کرنے کے لئے خدا، مذہب، فلسفہ، سیاست، علم، اور ٹھنڈے ڈھکوسلے یا کھلونے ایجاد کر لیتی ہے۔ اور جب تک اس کی معاشی ضروریات نشہ رہتی ہیں وہ برابر ان سے اپنے آپ کو فریب دیتی اور اپنے دل کو بہلاتی اور اپنے غم کو غلط کرتی رہتی ہے، لہذا انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کا نظام اس طرح سے بنائے کہ اس

میں اقتصادی ضروریات کی تکمیل اور تشفی کے سوائے اور کسی چیز کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر انسان کی زندگی میں اقتصادی ضروریات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی اقدار کی گنجائش باقی رہے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی اقتصادی ضروریات کی تکمیل اسی نسبت سے ناقص رہے گی۔ کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کی تائید کے لئے ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے کام لے کر اسے اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اس کی مدد سے اس نے ایک نظریہ تاریخ وضع کیا ہے جسے وہ تاریخی مادیات کا نام دیتا ہے۔

ڈارون کا نظریہ تو زندگی کی ابتداء سے لے کر صرف انسان کے ظہور تک کائنات کے ارتقاء کی کیفیت بیان کرتا ہے لیکن انسان کے ظہور میں آنے کے بعد ارتقاء کس طرف ہو رہا ہے؟ کارل مارکس نے اپنے نظریہ تاریخی مادیات کے ذریعہ اس سوال کا جواب مہیا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح سے وہ ڈارون کے نظریہ کو آگے لے گیا ہے۔ اس کے نزدیک حیاتیاتی مرحلہ کی طرح انسانی مرحلہ میں بھی ارتقاء کا سبب میکانیکی قوتوں کا عمل اور رد عمل ہے۔ تاریخی مادیات کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ کائنات ایک عالم گیر اشتراکی انقلاب کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ مادہ شروع سے ترقی کرتا چلا آیا ہے جب یہ ترقی کرتے کرتے انسان تک پہنچا تو اس کے ارتقاء نے انسان کے نظام ہائے معاشی کو اپنا راستہ بنایا، چنانچہ اس حرکت ارتقاء کی وجہ سے انسانی سماج کے نظام ہائے معاشی بدلتے رہے ہیں۔

اس تغیر کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں ایک اشتراکی انقلاب رونما ہوگا جو تمام دنیا میں پھیل جائے گا۔ تاریخی مادیات کا تصور فلسفہ اشتراکیت کو بہت مضبوط کر دیتا ہے، کیونکہ بظاہر یہ تصور اس سوال کا سب سے پہلا معقول اور مدلل جواب ہے کہ انسانی مرحلہ میں ارتقاء کا رخ کس طرف ہے۔ اس تصور نے فلسفہ اشتراکیت کو اس لئے بھی بہت فروغ دیا ہے کہ اس کو ماننے کے بعد ایک شخص مجبور ہو جاتا ہے کہ اشتراکیت کے سوائے

ہر نظریہ زندگی کے مستقبل سے کبھی مایوس ہو جائے۔ لہذا اسے عارضی، ناکارہ اور غلط قرار دے۔

برنارڈ شا، کارل مارکس کے اس نظریہ سے وجد میں آگیا اور وہ انتہائی عقیدہ میں ڈوب کر لکھتا ہے: —

”کارل مارکس کا سر ایک دیوتا کی طرح بلند ہے، کیونکہ اس نے

سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کر لیا ہے۔“

لیکن برنارڈ شا اور اس جیسے دوسرے لوگ جو مارکس کے عقیدت مند ہیں محض ایک غلط فہمی کا شکار ہیں کیونکہ سماج کے ارتقاء کا اصلی صحیح قانون ان کے سامنے موجود نہیں۔
کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کو مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے: —

”میرے سارے غور و فکر کا مرکزی تصور جس سے میں نے تمام دوسرے

نتائج اخذ کئے ہیں یہ ہے کہ ایک جماعت کے افراد اپنی اقتصادی ضرورت

کی تکمیل کا سامان پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص

قسم کے معاشی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کے

ظہور میں ان کی خواہش یا مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور ان کا سارا دار و مدار

کسب معاش کے ان قدرتی مادی ذرائع پر ہوتا ہے جو کسی خاص وقت

پر موجود ہوں۔ ان تعلقات کا مجموعہ جماعت کا معاشی نظام کہلاتا ہے اور

یہی نظام وہ اصلی بنیاد ہے جس پر سیاست اور قانون کی ساری عمارت

کھڑی کی جاتی ہے جو خاص قسم کے اجتماعی تصورات کو پیدا کرنے کا موجب

ہوتا ہے۔ گویا مادی ضروریات کو پیدا کرنے کا طریق انسان کی ساری اجتماعی

سیاسی اور روحانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ افسانوں کے نظریات

اور تصوّرات نہیں جو، ان کی مادی زندگی کو معین کرتے ہیں بلکہ یہ ان کی مادی زندگی ہے جو، ان کے تصوّرات اور نظریات کو معین کرتی ہے، کچھ عرصہ کے بعد ضروریات کی بہم رسانی کے قدرتی ذرائع ترقی کر کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ افراد کے موجودہ معاشی تعلقات کے ساتھ جن میں وہ پہلے عمل کرتے رہے ہیں مزاحم ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ تعلقات خود بھی ذرائع پیداوار کی نشوونما کی ایک خاص شکل کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم یہ ان کی نشوونما کے لئے ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اجتماعی انقلاب کے ایک دور کا آغاز ہوتا ہے، معاشی بنیادوں کے بدلے ہی ان کے اوپر کی ساری تعمیر (یعنی مذہبی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، قانونی اور علمی نظریات و تصوّرات) بتدریج یا فی الفور بدل جاتی ہے۔ اس تغیر پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس مادی تغیر میں جو ضروریات زندگی بہم رسانی کے لئے ضروری اقتصادی حالات کے اندر رونما ہوتا ہے (اور جس کا صحیح اندازہ لگانا ایسا ہی آسان ہے جیسا کہ قوانین طبعی کے عمل کا اندازہ لگانا، او اس تغیر میں جو قانونی، سیاسی، مذہبی، ہنری یا علمی تصوّرات میں مختصر یہ کہ نظریات میں رونما ہوتا ہے اور جس کے ذریعے سے لوگ اس تضاد کا احساس کرتے ہیں اور اسے اپنی جدوجہد سے انجام تک پہنچاتے ہیں۔ فرق کرنا چاہیے جس طرح سے ہم ایک فرد انسانی کی شخصیت کا صحیح اندازہ اس رائے کی بناء پر قائم نہیں کر سکتے جو وہ اپنے بارہ میں رکھتا ہے اسی طرح سے ہم اس قسم کے اجتماعی تغیر کے دور کی ماہیت کا صحیح اندازہ اس کے تصوّرات اور نظریات سے نہیں لگا سکتے بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم ان تصوّرات اور نظریات کا سبب مادی زندگی کے اندرونی تضاد میں یعنی

اس تصادم میں تلاش کریں جو سامانِ زندگی کو پیدا کرنے والی اجتماعی قوتوں اور ان معاشی تعلقات کے درمیان جن کے ذریعہ سے سامانِ زندگی پیدا ہو رہا ہے، رونما ہونے کو تیار ہوتا ہے۔ ()

مارکس کا ساتھی اینگلز جس نے اشتراکی فلسفہ کی تعمیر میں مارکس

اینگلز کا اختصار

کے ساتھ برابر کا حصہ لیا ہے۔ اسی خیال کو زیادہ مختصر اور

زیادہ واضح طور پر یوں بیان کرتا ہے: —

” مارکس نے اس سادہ حقیقت کا کھوج لگایا (جو آج تک تصورِ آ

اور نظریات کی بالائی نشوونما میں چھپی ہوئی تھی کہ) اس سے پہلے کہ انسان

سیاست، علم، ہنر، مذہب وغیرہ میں دلچسپی لے سکے، یہ ضروری ہے

کہ اسے خوراک، پانی، کپڑا اور مکان میسر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ زندگی کے اس سامان کی بہم رسانی جو فوری طور پر ضروری ہے اور

اس کے ساتھ ہی ایک قوم یا ایک دور کی نشوونما کا موجودہ مرحلہ ہی وہ

بنیادیں ہیں جن پر سیاسی رسم و رواج اور قانونی نظریات اور ہنری

بلکہ مذہبی تصورات تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

اول الذکر کو ایک سبب یا اصل کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ حالانکہ آج

تک، اول الذکر کی تشریح کے لئے مؤخر الذکر کو ایک سبب کے طور پر

پیش کیا جاتا رہا ہے۔ —“

(قرآن اور علم جدید ص ۲۶)



مادیت و دہریت پر

جہل کی عظمت کا غلبہ

ڈاکٹر رفیع الدین پٹی ایچ ڈی لکھتے ہیں۔
بظاہر ہمیں کائنات میں صرف دو
مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک مادہ

حقیقت کائنات مادہ ہے یا شعور

اور دوسرے شعور! — کیونکہ تمام چیزیں یا بے جان ہیں یا جاندار۔ تمام بے جان چیزیں
مادی ہیں۔ اور تمام چیزوں کا وصف شعور ہے۔ مادہ اور شعور کے ظاہری اختلاف کے باوجود
فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اس لاشعوری وجدانی یقین کی وجہ سے کائنات کی آخری
حقیقت ایک ہی ہونی چاہیے۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ مادہ اور شعور دونوں
کو ایک ہی چیز ثابت کیا جائے

اس لئے یا تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ شعور اصل میں مادہ
ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے یا یہ کہ مادہ درحقیقت شعور ہی کی صفات کا ایک

مظہر ہے۔ انیسویں صدی میں جب ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقا ایجاد کیا تھا۔ سائنس دان
اول الذکر نقطہ نظر پیش کیا کرتے تھے۔ اگرچہ فلسفیوں میں سے اکثر لوگ ہمیشہ متوخر الذکر
نظریہ کے حامی رہے ہیں۔

انیسویں صدی کے سائنس دان یہ سمجھتے تھے کہ مادہ ایک غیر فانی حقیقت ہے اس لئے
کسی چیز کی کوئی اصلیت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے خواص و اوصاف مادہ کی طرح
نہ ہوں، یعنی جب تک اسے مادہ کی طرح دیکھا یا چھوا نہ جائے یا وہ اس قابل نہ ہو کہ
مادہ کی طرح اس پر عمل میں تجربات کئے جاسکیں، چنانچہ یہ قدرتی بات تھی کہ وہ شعور کو ذی حیات
مادہ کی ایک خاصیت قرار دیتے تھے، یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے
کہ شعور کی مانند کوئی چیز تخلیق کائنات کا سبب ہو سکتی ہے۔ یا مظاہر قدرت کے ساتھ اس
کا کوئی سروکار یا علاقہ ہو سکتا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ شعور مادہ ہی کی ایک خاص حالت
کا وصف ہے جو اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مادہ اتفاقاً ایک خاص کیمیاوی ترکیب
پالیتا ہے یا طبیعیات کے قوانین کے تحت میں آجاتا ہے۔

قدیم سائنس دانوں میں سے بائل کہتا ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب
متحرک مادہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس سے انسانوں اور حیوانوں
کے مکمل اجسام ایسی حیرت انگیز موجودات یا اس سے بھی سے زیادہ
میرا العقول وہ اجزائے مادہ جو زندہ حیوانات کے بیج کی حیثیت
رکھتے ہیں خود بخود وجود میں آجائیں، چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کیلئے وہ قدرت کے
اندر تعمیر کنندہ رُوح یا قوت شعور کا ہونا ضروری قرار دیتا تھا۔

اسی طرح انیسویں صدی کے ایک سائنس دان لارڈ کیلون کی ذہانت نے بھی
یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا کہ قدرت، شعور کے اوصاف سے بے بہرہ نہیں اور یہ کہ کائنات
کے اندر ایک تخلیق اور راہ نما قوت بھی کار فرم ہے لیکن فلسفہ جو سائنس کی طرح حقیقت

کی کسی جزوی یا محدود واقفیت پر کبھی قانع نہیں ہوا۔ جو تلاش صداقت میں عقل اور وجدان دونوں سے پورا کام لیتا رہا ہے اور بہت تک ان پابندیوں سے بھی آزاد ہے جو تحقیق علم کے بارے میں سائنس نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ یعنی تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر کسی چیز کو باور نہ کرنا ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتا رہا ہے کہ عقدہ کائنات کا معقول اور مکمل حل جس کے لئے انسان فطرتی طور پر بیتاب ہے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نظام عالم میں شعور کو ایک مرکزی حیثیت نہ دی جائے۔

قرون وسطیٰ کے یورپی فلسفہ کا مقصد تو دین عیسائیت کی عقلی توجیہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن شعور جیسا کہ وہ خدا اور کائنات کے اندر موجود ہے۔ نہ صرف قرون وسطیٰ کے فلسفہ کا بلکہ عصر جدید کے ان بڑے بڑے فلسفیانہ نظریات کا بھی واحد موضوع ہے جو ڈیکارٹ، لیبنز، شوپن آئر، نیٹشے، کانٹ اسپینوزا، ہیگل، فیشے، کروچے برگسان ایسے مقتدر فلسفیوں نے پیش کئے ہیں اور جن میں وہ خدا روح، کائنات، حقیقت مطلقہ، تصور مطلق، قوت شعور، ارادہ کائنات، شعور ابدی، افراد حیات، خود شعوری، قوت حیات، وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سائنس کی مادیات پر جس فلسفی نے سب سے پہلے شدید اعتراضات کئے وہ انگلستان کا بشرپ جارج برکلی تھا جس نے کہا مادی دنیا اپنی کوئی جدا ہستی نہیں رکھتی۔ کیونکہ اسے ہم فقط حواس کے ذریعے سے جانتے ہیں اور یہ جانتا شعور کے بغیر ممکن نہیں، چونکہ ہمارے شعور سے باہر مادہ کی کائنات کا اپنا کوئی وجود نہیں ہو سکتا، اس لئے جو چیز حقیقتاً موجود ہے وہ شعور ہے نہ کہ مادہ۔ حواس کے ذریعے سے ہمیں جس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے وہ مادہ نہیں بلکہ اس کا رنگ، صورت، شکل، آواز، نرمی اور سختی وغیرہ مختلف اوصاف ہیں۔ اور ان اوصاف کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ شعور ان کا احساس کرے۔ اور شعور کے بغیر ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو سکے گی۔ پس مادہ کی حقیقت فقط شعور ہے۔

برکے اپنے نظریہ کی روشنی میں ایک غیر فانی ابدی شعور کی ہستی کو ثابت کرنے کیلئے یوں دلیل قائم کرتا ہے :—

”آسمان کے تمام ستارے، زمین کی تمام چیزیں مختصر یہ کہ وہ تمام اشیاء جن سے یہ عظیم الشان دنیا بنی ہے شعور کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتیں، اگر میں ان کا احساس نہ کروں یا کسی اور مخلوق ہستی کے شعور کے اندر موجود نہ ہوں تو پھر یا تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں یا ان کا وجود کسی ابدی شعور کے علم میں ہے۔“

برکے کی اس تصویریت کو حال ہی میں ایک جدید فلسفہ سے جسے نو تصویریت کہا جاتا ہے اور جس کے بڑے شارحین اٹلی کے دو فلسفی کرویچے اور جینٹیلے ہیں۔ بہت مضبوط سہارا مل گیا ہے۔ یہ دونوں فلسفی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کائنات روح یا شعور کے سوائے اور کچھ نہیں۔ ان کا فلسفہ نہ صرف زمانہ کے لحاظ سے جدید ترین ہے بلکہ اس سے حکماء کا خیال ہے کہ اس دور کے فلسفیوں میں سے ایک نہایت ہی اچھوتا یقین افروز فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ :—

”ہمارے شعور کا احساس ہی ایک چیز ہے جس کی حقیقت کے بارے میں ہمیں کوئی یقین ہو سکتا ہے۔“

اس مفروضہ سے قدم بقدم استدلال کرتے ہوئے یہ فلسفی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر کائنات کی حقیقت کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم جان سکتے ہیں تو وہ لامحالہ ہمارے اپنے شعوری تجربہ یا احساس کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے اور چونکہ خود شعوری واضح ترین اور بلند ترین احساس ہے اس لئے کائنات کی حقیقت لازماً ایک اعلیٰ قسم کی خود شعور ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے لئے اس کا

انیسویں صدی کی فرسودہ سائنس

کے خیالات کو قبول کرنا ناممکن تھا، کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے مادی قوانین کی بنیاد ہی اُکھڑ جاتی تھی۔ جب برکلی نے نیوٹن کے طبیعیاتی قوانین پر سب سے پہلے اعتراض اُٹھایا تو سائنسدانوں نے ایک نفرت انگیز طعن و تشنیع کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ کے تئیر تھی کہ اس بحث میں کہ آیا مادہ حقیقی ہے یا شعور فلسفی جلد ہی سائنس دانوں پر غالب آجائیں گے اور وہ بھی سائنس دانوں کو اپنی تحقیقات اور اپنے ہی انکشافات کی بدولت۔۔۔

سائنس اپنے بُت کو خود توڑتی ہے | فلسفی تو مدت سے کائنات کی ایک ایسی تشریح پر مقرر تھے

جو حقیقت شعور پر مبنی تھی، اگر ان کا لفظ نظر ایک عام قبولیت حاصل نہ کر سکا تھا تو اس کی وجہ فقط سائنس ہی رکاوٹ تھی۔ لیکن اب بیسویں صدی کے سائنس کے انکشافات نے جن میں نظریہ اضافیت، نظریہ کوآئنٹم اور علم حیات کے بعض حقائق شامل ہیں یہ رکاوٹ دور کر دی ہے اور مادیات کا بُت جسے سائنس نے تراشا تھا سائنس ہی کے ہاتھوں پھوڑ پھوڑ ہو گیا ہے۔ طبیعیات جدید کی تحقیق نے مادہ کو جو کسی وقت ایک کھوس سا دہ اور روشن حقیقت کا درجہ رکھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی قوت، حرکت، فاصلہ، وقت اور ایٹم کو محض لاشے میں بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ ہیں:۔۔۔

”جدید مادہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ میں نہیں آ سکتی، یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی رو کا ایک جال یا امکا کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادہ کی بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ہی ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔“

نظریہ اضافیت کے نتائج | پروفیسر روڈرے نظریہ اضافیت سے پیدا ہونے والے نتائج سے بحث کرتے

ہوئے اپنی کتاب "فلسفہ اور طبیعیات جدید" میں لکھتا ہے: —

"اس طرح مادہ الیکٹرانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو خود لطیف لہروں کی صورت اختیار کرتے ہوئے فنا ہو جاتے ہیں۔ گویا مادہ کا مستقل نقصان اور قوت کا ناقابل تلافی انتشار عمل میں آتا ہے۔ دوام مادہ کے اس ہمہ گیر اصول کی بجائے جسے سائنس دانوں نے سائنس کی بنیاد قرار دیا تھا اور جو اسے قابل فہم بناتا تھا، یعنی نہ تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے۔ اب ہمیں یہ متضاد اصول وضع کرنا چاہیے کہ کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔ دنیا ایک آخری بربادی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور ایتھر جس کے بارہ میں ناحق یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ وہ کائنات کا آخری سہارا ہے۔ کائنات کی آخری قبر ثابت ہوتی ہے۔"

ہیری شمرٹ کا تبصرہ | ڈاکٹر ہیری شمرٹ نے اپنی کتاب میں "اضافیت

اور کائنات میں یہ بتاتے ہوئے کہ نظام عالم میں اضافیت کے داخل ہونے کے بعد کائنات کی کیفیت کیا رہ جاتی ہے۔ بڑے یا اوسانہ انداز میں لکھا ہے: —

"فاصلہ اور وقت بے حقیقت ہو کر رہ گئے ہیں، خود حرکت بے معنی ہو گئی ہے۔ اجسام کی شکل و صورت ہمارے نقطہ نظر پر موقوف ہو گئی ہے اور کائنات کی ایتھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کر دی گئی ہے۔ — افسوس! تم نے خوبصورت دنیا کو ایک شدید ضرب کے ساتھ برباد کر دیا۔ اب یہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور اس کے ٹکڑے منتشر کر دیئے کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہم ان ٹکڑوں کو فنا کے پیرہن کرتے ہیں اور بڑے درد کے ساتھ اس حُسن کا ماتم کرتے ہیں جو مٹ گیا ہے۔"

شعور حقیقت کائنات ہے! | لیکن اگر مادہ حقیقی اور پائیدار نہیں تو پھر
مادہ کے ثابت ہونے پر ہم مخلوقات

کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کی وجہ کیا بتا سکتے ہیں جس میں جا بجا حسن کار، ہنس،
مدعا، تناسب، ہم آہنگی اور بے خطاریا ضیائی ذہن کے اوصاف کار فرما نظر آتے ہیں۔
یقیناً یہ سب شعور ہی کے اوصاف ہیں۔ لہذا شعور ہی کائنات کی وہ آخری حقیقت
ہے جس سے دُنیا جگمگا رہی ہے۔ —

ماہرین طبعیات کی تلاش حقیقت | ظاہر ہے کہ مادہ کے فانی ثابت
ہونے کے بعد اس نظریہ کیلئے

کہ کائنات کی بنیاد رُوح یا شعور ہے۔ نہ صرف راستہ صاف ہو گیا ہے بلکہ اب اس
نظریہ کے تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ آج رُوح یا شعور کو کائنات کی حقیقت
قرار دینا عقلی طور پر اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انیسویں صدی میں یہ ماننا ضروری تھا کہ کائنات
فقط مادہ سے بنی ہے۔ فلسفہ تو اپنی ساری تاریخ میں سائنس کی تائید کے بغیر بلکہ سائنس کی
مخالفت کے باوجود کائنات کی روحانی توجیہ پر اصرار کرتا رہا ہے اور فلسفہ کا یہ نظریہ قدیم
سائنس کے مادیاتی نظریہ سے کسی طرح سے کم معقول یا قابل قبول نہیں تھا۔ لیکن اب سائنس
بھی اس کی تائید میں وزن دار شہادت پیش کر رہی ہے۔ —

چونکہ مادہ بے حقیقت اور فانی ثابت ہوا ہے۔ لہذا طبعیات کے ماہرین محسوس
کرنے لگے ہیں کہ اب وہ مادہ کی دُنیا کے اندر محدود رہ کر طبعیات کے مسائل کو حل نہیں
کر سکتے اور مجبور ہیں کہ مادہ کی دُنیا سے آگے نکل کر سچائی کی جستجو کریں، کیونکہ اب مادہ کی
حقیقت مادہ سے پرے کی دُنیا میں ہی معلوم کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلینڈ
اور یورپ کے بہت سے ماہرین طبعیات مثلاً ایڈنگٹن، جینرز، واسٹ ہیڈ، آئن سٹائن،
شرودنگر اور پلینک مادی دُنیا کی حقیقت کی وضاحت رُوحانی نقطہ نظر سے پیش کر رہے

ہیں۔ اب وہ ماہرین طبعیات ہی نہیں بلکہ ماہرین ماوراء الطبعیات بھی ہیں۔ ان سب باتوں کے دلائل اس مفروضہ کی تاکید کرتے ہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک شعور یا ذہن ہے۔! نظریہ کوائنٹم کے موجد پروفیسر ماکس پلانک کے ساتھ مطابقت دے۔ ڈبلیو۔ این۔ سلیوین کی ایک گفتگو ۲۶ جنوری ۱۹۳۷ء کے رسالہ آئزوردر میں شائع ہوئی تھی اس میں پروفیسر پلانک نے کہا تھا:۔۔۔

”میں شعور کو ایک بنیادی حقیقت سمجھتا ہوں، مادہ کو شعور کا نتیجہ سمجھتا ہوں ہم شعور سے آگے نہیں جاسکتے، ہر چیز جس کا ہم ذکر کرتے ہیں یا جس کو موجود تصور کرتے ہیں اس کی مہتی شعور پر مبنی ہے۔“۔۔۔

آئن سٹائن لکھتا ہے:۔۔۔

”کائنات پر شعور کی حکومت ہے خواہ یہ شعور کسی ماہر ریاضیات کا سمجھا جائے یا کسی مصور کا یا شاعر کا، یہی وہ حقیقت جو ہستی کو معنی بخیز بتاتی ہے ہماری روزمرہ کی زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ ہماری اُمید بڑھاتی ہے اور جب علم ناکام رہ جاتا ہے تو یقین کے ساتھ ہمیں قوت بخشی ہے۔“

سر جیمز جیننگز کا استدلال یہ ہے کہ مادہ سب کا سب ریاضیاتی نسبتوں میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ریاضیات کا دخل جس طرح سے سالمہ کی ہیئت ترکیبی میں نظر آتا ہے، اسی طرح سے اجرام فلکی کے نظامات میں بھی موجود ہے۔ ریاضیات کے قوانین جس طرح قریب ترین مادی اشیاء پر مادی ہیں۔ اسی طرح کائنات کے دور دراز حصوں پر بھی حکمران ہیں لیکن ریاضیات کا علم جس قدر ہمیں اس وقت حاصل ہوا ہے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ ہمارے اپنے منطقی یا عقلی استدلال سے حاصل ہوا ہے جس کا کائنات کے مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں، اپنی قوت استدلال کی رہنمائی میں اپنے ہی ذہن کی پیداوار کے طور پر قوانین ریاضیات کو مرتب کرنے کے بعد جب ہم کارخانہ قدرت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف کائنات کی تعمیر ان قواعد کے عین مطابق ہوئی ہے بلکہ یہی قوانین اس کائنات کی آخری صورت ہیں چونکہ مادہ غیری حقیقی ہے۔ اس لئے کائنات آخر کار قوانین ریاضیات کے ایک مجموعہ کے بغیر کچھ ثابت نہیں ہوتی، ہم نے ان قوانین کو جو ہمارے باہر کی دنیا میں جاری اور ساری ہیں خود بخود کیونکہ دریافت کر لیا اور پھر یہ قوانین مادی دنیا کی تعمیر میں خود بخود کیونکہ کام آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ہماری طرح کے ایک شعور کی تخلیق ہے۔ یہ شعور ہماری طرح ٹھیک ٹھیک ریاضیاتی اور منطقی انداز کے ساتھ سوچ سمجھ سکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج کی دنیا اور ہمارا اپنا شعور دونوں اسی شعورِ عالم نے پیدا کئے ہیں۔ —

سر جیمز جینز اپنی کتاب "پراسرار کائنات" میں لکھتا ہے: —
 "کائنات کسی مادی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی اور میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اپنی حقیقت ایک خیال سے زیادہ نہیں۔ آج سے تیس سال پہلے ہم یہ سمجھتے تھے یا فرض کرتے تھے کہ ہم ایک آخری میکائیکی حقیقت کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ آج کی دنیا بہت حد تک اس بات پر متفق ہے اور جہاں تک علمِ طبیعیات کے ماہرین کا تعلق ہے اس رائے کے ساتھ اختلاف قریباً مفقود ہے کہ علم کا دریا ایک میکائیکی حقیقت کی طرف بہ رہا ہے۔ کائنات ایک بڑی مشین کی بجائے ایک بڑے تصور کی صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ اب شعور کوئی ایسی چیز نہیں جو مادہ کی دنیا میں اتفاقاً داخل ہو گئی ہو بلکہ اس کی بجائے ہم یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ ہمیں شعور ہی کو مادہ کی دنیا کا خالق اور حاکم قرار دینا چاہیے۔ ہمارے شعور کو نہیں بلکہ اس شعور کو جس کے اندر وہ سالمات جن سے ہمارا شعور صورت پذیر ہوا ہے۔ خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید علم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے پہلے ملبہ باری سے قائم کئے

ہوئے تاثرات پر کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی دنیا میں آ پہنچے ہیں جو زندگی سے کچھ سرکار نہیں رکھتی یا زندگی سے عملاً عداوت رکھتی ہے، نظر ثانی کریں، اغلب ہے کہ مادہ اور شعور کی قدیم دوئی جو اس فرضی عداوت کی ذمہ دار تھی بالکل ناپید ہو جائے، نہ اس لئے کہ مادہ اور بے حقیقت ثابت ہو جائیگا بلکہ اس لئے کہ کھڑوس اور حقیقی مادہ آخر کار شعور ہی کی ایک مخلوق اور شعور ہی کا ایک ظہور مانا جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ایک ایسی مدہ اور منظم ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے جس حد تک ہمیں علم ہو سکا ہے۔ جذبات، اخلاق اور احساس حسن کے اوصاف کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک ایسے انداز فکر کے لحاظ سے جسے ہم کسی بہتر لفظ سے تعبیر نہ کر سکنے کی وجہ سے ریاضیاتی انداز فکر کہتے ہیں۔

(قرآن اور علم جدید ص ۱)

مادہ و مادہ ظہور اور مشابہت کا نظریہ درست نہیں۔

وحدت و جہود کے نظریے میں

توحید کی تعبیر

وحدت و جہود کا مسئلہ صدیوں سے حکماء، صوفیہ، اہل کلام اور اہل ظواہر تمام طبقوں میں معرکہ خیز رہا ہے۔ یہ مسئلہ دینی زندگی کے اندر سے نہیں ابھرا، اسلامی اور دینی زندگی تو صدر اسلام میں خالص ترین صورت میں موجود تھی۔ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی انہم مسئلہ بنایا اور نہ صحابہ کرامؓ اس بحث میں پڑے۔ اسلام کا اصل مقصد توحید کی تبلیغ تھی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اللہ کے سوا زمین و آسمان میں یا مائے ارض و سما، دوسرا کوئی معبود نہیں۔ فقط اسی ایک معبود کی عبادت کی جائے۔ اسی کو رب اور مالک جزا و سزا یقین کیا جائے، اسی کی طرف یکسو ہو کر رُخ کیا جائے۔ نہ فطرت کے مظاہر کی پرستش کی جائے۔ اور نہ انسان ایک دوسرے کو مِنْ دُونِ اللَّهِ ارباب بنالیں۔ خالق ایک ہی ہے جو مخلوق کو عدم سے وجود میں لاتا اور پھر جسے چاہے وجود سے عدم میں واپس لے جاتا ہے۔ انسان اپنی مرضی کو اس کی مرضی سے ہم کنار کر کے سعادت دارین حاصل کر سکتا ہے۔ خالص سلامی توحید یہی تھی اور اسلام کا یہ دعویٰ تھا کہ یہی دین قدیم اور دین مستمر ہے۔ ہر نبی کی تعلیم کا مقصد اصل میں یہی تھا۔ شرائع اور ضوابط کا اختلاف مروجہ زمانہ اور تغیر احوال سے ظہور میں آتا رہا۔ لیکن شعائر اور طریق عبادت کا فرق فروغی ہے۔ جہاں توحید

ہے وہاں سب کچھ ہے اور جہاں توحید نہیں وہاں تمام ظواہر بے مغز چھلکا ہیں۔
 وحدت وجود کا مسئلہ وہاں پیدا ہوا۔ جہاں دین میں علم کلم اور فلسفے کی آمیزش ہوئی
 ہندوؤں میں اس مسئلے نے ویدانت کی صورت اختیار کر لی جس کے اندر خدایا ایشور ایک اعتباری
 مظہری اور اضافی تصور بن گیا، وہ ہستی مطلق نہ رہا۔ ویدانت نے تعلیم دی کہ ہستی مطلق ایک
 ذاتِ بحت ہے جو صفات سے معرّی ہے، رنگن برہما ہی اصل ہستی ہے۔ اس میں خالقیت
 کی صفت بھی نہیں جس کو مخلوقات کہتے ہیں وہ فریبِ نظر اور وہم کی آفرینش ہے۔ عالمِ النفس
 و آفاق تمام مایا ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں۔ روحِ انسان کی انفرادیت سب کے بڑا دھوکا
 اور ہر قسم کے فریب کا ماخذ ہے، اصل وجود ایک ہی ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، اتما
 کو اگر صحیح عرفان ہو جائے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ پرماتما کے سوا کچھ نہیں۔
 سمندر کے علاوہ موج و جاب کا کوئی وجود نہیں۔ یہ لا الہیت کا نظریہ ہے جس کا قدم
 اللہ کی طرف نہیں اٹھتا۔ اس میں نفیِ مُسلم ہے اور اثباتِ موہوم، ذاتِ بے صفات کے
 کے سوا باقی سب کچھ معدوم۔

سنو چار یہ جو ویدانت کا سب سے بڑا مفسر ہے اس کا نظریہ بھی یہی ہے۔
 بدھ مت بھی اسی لاموجودیت اور لا کونیت کی تبلیغ ہے۔ بدھ مت میں کہیں خدا کا
 تصور نہیں، نفسی مظاہر اور طبعی مظاہر سب آرزوئے حیات کی پیداوار ہیں نہ نفس کی کچھ
 حقیقت ہے اور نہ آفاق کی۔ آرزوئے حیات کی نفی کے بعد یہ ناپید ہو جاتے ہیں کیونکہ ان
 کی ہستی سیمیائی ہے، صبحِ معرفت کے طلوع ہونے کے بعد وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔
 یہ بھی تھی اکِ سمیا کی سی نمود : صبح کو رازِ مہ و خستِ رکھلا (غالب)
 یونانی فلسفہ ترقی کرتے کرتے سقراط اور افلاطون کے نظریہ علم وجود تک پہنچا کہ ہستی
 مطلق عقلِ کل ہے جو کُلِّ تصورات کا ایک وحدانی نظام ہے۔ یہ کُلِّ تصورات جسے مثل افلاطونی
 یا اعیانِ ثابۃ کہتے ہیں۔ ایک ابدی حقیقت ہیں یہی نفس کے تصورات نہیں بلکہ علی الاطلاق

۱۔ وحدۃ الوجود کے نظریے میں اعیانِ ثابۃ کی اصطلاح اہم مقام رکھتی ہے۔ اور یہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہر شے کی حقیقت اتنی ہے جتنا کہ اس کو نورِ ازی سے حصہ ملا ہے جس طرح سورج کی کسی کرن کا وجود بالذات اور مستقل نہیں۔ اسی طرح تنزلات کے کسی درجے میں بھی کوئی شے مستقل انفرادی وجود نہیں رکھتی۔

وحدت وجود کا یہ نظریہ مسلمانوں کے ہاں بھی فلسفہ تصوف کا ایک اہم جزو بن گیا، اور مغرب میں عیسوی تصوف پر بھی اس نے پائیدار نقش چھوڑے ہیں۔ یہ نظریہ ویدانت اور بدھ مت کے نظریہ وجود سے مختلف ہے۔ اور سقراط اور افلاطون اور ارسطو کی تعلیم کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ جہاں عقلِ کل ہی ایک ابتدائی اور انتہائی حقیقت ہے۔ فلاطینوس کے ہاں مستی مطلق ماورائے عقل ہے۔

وجود کی وحدت ضروری نہیں کہ عقل کی وحدت یا خدا کی وحدت ہی کے ساتھ وابستہ ہو۔ یونانی فلسفے کا آغاز یہاں سے ہوا کہ تمام موجودات کی اصلیت پانی ہے اور جو کچھ ہے وہ پانی ہی کی ایک مبدل صورت ہے اس کے بعد دوسروں نے کہا کہ پانی نہیں بلکہ آگ ہے۔ افلاطون کے ہم عصر دیمقراطیس نے ذراتی مادیت کی بنا ڈالی کہ حیات کی حقیقت مادہ ہے جس کے اندر لامتناہی اجزائے لایتجزی ہیں انہیں اجزاء کی بدلتی ہوئی ترکیبوں سے چیزیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ تمام کون و فساد ان مادی ذرات ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نظریہ مادی وحدت وجود ہے جس کا تعلق نہ عقل کی وحدت سے ہے اور نہ نفس یا خدا کی وحدت سے۔

اسلامی تصوف میں جو نظریہ وحدت وجود ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں، ہمہ اوست، جو کچھ ہے وہ خدا ہی کی ذات کا مظہر ہے ہستی ایک ہی ہے تمام مختلف مخلوق میں ہستی مشترک ہے۔ اور وہ ہستی خدا ہے۔ ایک فارسی متصوف شاعر کے دو اشعار کا مضمون یاد رہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: اے خدا تو مجھے دھمکی دیتا ہے کہ میں تجھے دوزخ میں ڈال دوں گا۔ مجھے یہ بتا کہ دوزخ کا وجود ہے کہ نہیں اگر اس کا

وہود حقیقی ہے تو وہ تیرے بغیر نہیں ہے تو دوزخ معدوم ہے —
 مسلمانوں میں جب وہود کی وحدت کی بحث شروع ہوئی تو اکثر صوفیوں نے
 اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔ مسلمان کہتا تھا لا الہ الا اللہ بعض صوفی کہنے
 لگے لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ اللہ کے سوا کچھ موجود
 نہیں اور ہر وہود میں مؤثر حقیقت ہے وہ خدا ہی ہے —

اسلامی توحید کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اب ایسے لوگ
 آگے ہو کہنے لگے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں تو عابد اور معبود کا فرق برٹ جائیگا
 اور پرستش کی حقیقت کچھ نہ رہے گی —

غالب نے اس نظریے کو اپنے فارسی کلام میں اس طرح بیان کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے
 ”خدا نے اپنے سے علاوہ دوسروں کے موجود ہونے کا وہم پیدا کر کے خواہ مخواہ
 دنیا میں ایک ہنگامہ مچا دیا ہے۔ حرف کن کہہ کر اور موجودات کو مہستی کا انداز دے کر خود
 اپنی مہستی کو گمان میں مبتلا کر دیا ہے۔ آنکھوں کے اندر بھی آپ اور باہر بھی آپ دیکھنے
 والا بھی خود اور دکھائی دینے والا بھی خود، اپنی ہی دونوں حیثیتوں کے درمیان رسم پرستش
 کا ایک وہمی پردہ لٹکا دیا ہے۔ لیکن خود غالب کو اپنا یہ نظریہ مطمئن نہ کر سکا وہ حیرت میں
 ڈوب کر پوچھنے لگتا ہے : —

۵ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود : پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

۱۔ اسی نظریے کے تحت ابن عربی کے نزدیک دوزخ عذاب کا مقام نہیں ہے

بلکہ ایک راحت کی جگہ ہے —

۲۔ صوفی عبد الرحمن لکھنوی نے اپنی کتاب کلمۃ الحق میں تصریح کی ہے۔ موجودہ
 مسلمانوں کا کلمہ صحیح نہیں ہے۔ کلمے کا صحیح معنی یہ ہے کہ جس باطل معبود کی بھی پرستش کی
 جائے حقیقت میں وہ اللہ ہی کی عبادت ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں : ابر کیا چیز ہے ہوا کیا چیز ہے
اور جبکہ کہتا ہے کہ : —

۵ ہاں کھائی تو موت فوری ہستی : ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے : پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
۵ مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین است : لیکن نمی توان کہ اشارت باو کند

صاحب مفتاح العلوم مولوی محمد نذیر صاحب فرماتے ہیں کہ : —

"وحدت الوجود کے قائل صوفیہ کہتے ہیں کہ وجود مطلق ایک ہے جو وہوب و امکان
قدیم و حادث مجرد و جسمانی مومن و کافر ظاہر و خفی وغیرہ مختلف مظاہر میں ظاہر ہے لیکن ہر
مظہر کا حکم جدا ہے اور مظاہر کے احکام میں فرق قائم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مومن کیلئے
نجات کا حکم ہے اور کافر کے لئے قتل و قید کا حکم ہے۔" لواح جامی میں بھی یہی تعبیر ہے۔

۵ ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد : مگر فرق مراتب نسبی زندگی (جامی)

اس کے بعد فتاویٰ عزیزی میں سے شاہ عبدالعزیزؒ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

"اَوَّلُ مَعْنَى اِیْنِ کَلِمَہِ بَایْدَ فہْمِیدُ بَازِ حَقِیْقَتِ حَالِ بَایْثِنِیدَ کہ وجود حقیقی بمعنی

بابہ الموجودیت نہ بمعنی مصدری اعتباری ایک چیز است کہ دروا

و در ممکن ممکن و در جوہر جوہر و در عرض عرض است۔ و اِیْنِ اِخْتِلَافَاتِ

موجب اِخْتِلَافَاتِ در ذات نمی شوند، مثل شعاع آفتاب کہ

بر پاک و ناپاک می افتد و فی ذاتہ پاک است ناپاک نمی شود، و اِیْنِ

مَسْئَلَہِ فِی نَفْسِہِ حَقِّ اسْتِ و ہِیْچِکُونِ خِلَافِ شَرِیعِ نیست۔ زیر کہ ہر مرتبہ

از مراتب اِیْنِ وجود حقیقی حکمے جدا گانہ دارد و شرع شریف بیان حکم

ہر مرتبہ مے کند بعضے را ہادی و بعضے را مضل و بعضے را

واجب الاطاعت و بعضے را واجب العصیان و بعضے را

و بعضے راحرام و بعضے راپاک و بعضے رانا پاک مے فرماید، مروجہ کوتاہیوں
 دانند کہ ایں ہمہ اختلافات ذات است۔ حاشا و کلاً ایں ہمہ اختلافات
 شیون و اعتبارات است مانند آکہ در معرکہ جنگ غیر از جسم نمودارنی
 باشد، اگر قاتل است جسم است و اگر مقتول است جسم، است، و علیٰ ہذا
 لقیاس۔ راکب مرکوب و غالب و مغلوب در قرآن مجید چند جا اشارہ
 بایں مسئلہ واقع شدہ صریح ترین آیات بریں مسئلہ ایں است سنیہم
 آیتنا فی الافاق و فی انفسہم حتیٰ یتبین لہم انہ الحق
 اولویکف بریک انہ علی کل شیء شہید۔ الا انہم
 فی مریۃ من لقاء ربہم الا انہ بکل شیء محیط
 و نیز آیہ ہوا لاول و الآخر و الظاہر و الباطن ۱۰

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اپنے رسالہ وحدت الوجود میں تحریر فرماتے ہیں کہ:
 "اللہ تعالیٰ خود اپنے وجود میں اور اپنے توابع کے وجود میں غیر کا محتاج نہیں بلکہ اس کی
 ذات ہی اس کے وجود کی مقتضی ہے اور اس کی ذات ہی اپنے ارادے کے موافق ممکنات
 کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔ ممکن کا مابہ الوجودیت کیا ہے؟ اس کے وجود سے ارادہ الہ
 کا تعلق ہے اور یہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اور اس ارادہ کا
 تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کا مقتضی ہے کوئی دوسری چیز درمیان میں واسطہ نہیں ہے پس ممکنات
 کا مابہ الوجودیت ذات حق کے ہوا اور کچھ نہیں۔ اب ذات حق تعالیٰ کو وجود معنی مابہ الوجودیت
 کہنا بالکل حق اور صواب ہے اور اس کا تمام اشیاء پر احاطہ جو قرآن کریم سے ثابت ہے اس کے

۱۰ شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی سابقہ تحریر کو قرآن کی اس آیت کے ساتھ مؤید کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا سرس
 غلو ہے اور قرآن کی سرس ترخیف ہے، دیکھئے وحدۃ الوجود ایک ایسا خطرناک نظریہ جس نے بڑے بڑے اکابر
 کو جادہ مستقیم سے ہٹا دیا ہے۔ (اسدی)

یہ معنی ہیں کہ تمام اشیاء کا مابہ الوجودیت وہی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کو وجود مطلق لا بشرطی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ذات جس طرح اپنے وجود کی مقتضی ہے اسی طرح اپنی تمام صفات کمال مثلاً سمع، حیات، بصر، علم، قدرت، ارادت اور کلام کے وجود کی بھی مقتضی ہے اسی لئے اس کی ذات کو واجب بالذات کہتے ہیں اور اس کی صفات کو جواہل اسلام کے نزدیک ذات پر زائد ہیں واجب بالغیر ہیں اے۔۔۔۔۔

اکثر صوفیاء اور علماء اس مسئلے سے درست و گریباں ہوئے ہیں جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ تمام جنگ فقط الفاظ کا، میر پھیر اور اصطلاحات کی آویزش معلوم ہوتی ہے۔ جناب مولانا احمد حسن کانپوری اور شیخ ولی محمد سے کچھ عبارتوں سے اقتباسات اس غرض سے نقل کئے جاتے ہیں کہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ عقل استدلالی نے اس گتھی کو سلجھانے کی بجائے کس قدر اور الجھا دیا ہے مولانا احمد حسن صاحب فرماتے ہیں کہ:۔۔۔۔۔

”علمائے نزدیک عالم قدیم زمانی ہے جس سے پہلے کوئی عدم خارجی نہیں یعنی رہبات نہیں کہ عالم کسی وقت خارج میں موجود نہیں تھا پھر موجود ہو گیا، ہاں اگر عالم کے لئے حدوث ہے تو حدوث ذاتی ہے جس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ عالم سے پہلے عدم مرتبہ ذات عقل میں ہے نہ کہ خارج اور واقع میں اور عالم کا ذات واجب کی طرف محتاج اور اس سے مؤخر ہونا لحاظ عقل میں ہے جیسے ہاتھ اور قلم کی حرکت کہ قلم کی حرکت اپنے وجود میں حرکت دست کی محتاج ہے وہ لحاظ عقل میں اس سے متاخر بھی ہے نہ کہ بحسب زمان متاخر، کیونکہ بحسب زمان وہ اس سے مقارن ہے۔۔۔۔۔

آئمہ متکلمین کہتے ہیں کہ عالم حادث بحدوث زمانی ہے یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ یہ عالم موجود نہ تھا پھر پیدا ہوا۔ اور یہ نظریہ قرآن کے عین مطابق ہے۔“

اے مولانا ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تصریح بھی قرآن سے سراسر خلاف ہے۔ (اسدی)

وجودی صوفیہ کہتے ہیں کہ عالم حادث ہے لیکن حدوث زمانی سے نہیں جیسے کہ متکلمین کا زعم ہے اور نہ حدوث ذاتی کے ساتھ جو حکما کا خیال ہے، بلکہ ان دونوں کے ماورے ایک ایسے حدوث کے ساتھ جو واقعی اور نفس الامری ہے یعنی عالم اپنی ذات کے لحاظ سے خارج میں معدوم ہے مگر فیض حق اور قابلیت اعیان کے ساتھ موجود ہے۔ جیسے اشکال و ألوان اپنی ذات کے لحاظ سے تاریک ہیں اور ان کی نمائش نور آفتاب کے فیض اور نور چشم کے قبول کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک نور مفقود ہو تو وہ اشکال و ألوان اسی طرح تیرہ و نابود ہو جاتے ہیں۔

چونکہ افاضہ حق اور قابلیت اعیان دائمی ہے۔ پس عالم بحرب زمان قدیم ہوا لیکن جب ذات عالم پر نظر کریں تو اشیاء کا وجود عدم کے بعد ہوا۔ بلکہ اشیاء ہر آن میں حادث ہوتی ہیں۔

صاحب مفتاح العلوم فرماتے ہیں۔

” واضح ہو کہ اگر عالم کو قدیم مانا جائے تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کی صورت موجود اور ہیئت حاضرہ دائمی و ابدی ہو جو قیامت و حشر کے عقیدہ سے معارضی ہے۔ لہذا محققین صوفیہ کے مسلک پر یہ شبہ عارض ہو سکتا ہے۔ وہ کسی حد تک حکماء کے مذہب کے مشابہ ہے جو حشر و نشر کے منکر ہیں لیکن بعض صوفیہ قدیم عالم کے قائل ہیں اور ان کے کلام سے کہیں صراحتہ اور کہیں کنایتہ یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ عالم کے دوام کے معتقد ہیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات ظاہر المعنی بصورت جہوری پکار رہی ہیں کہ دنیا کی یہ موجودہ حالت استمراراً قائم نہیں رہی بلکہ اس میں ایک عظیم تغیر آنے والا ہے۔ تاہم لازم ہے کہ ہم صوفیہ علیہ کے متعلق کسی بدگمانی کو اپنے دل میں راہ نہ پانے میں خصوصاً جب ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ لوگ سواد اسلام کی ایک برگزیدہ جماعت ہیں۔ پھر اس کو گویہ گروہ کی بابت یہ ارشاد ہے کہ ان کو کشف و ذوق سے حدوث و قدم کا باہمی رابطہ معلوم ہو گیا

صلی صوفیہ اپنے مقام کے لحاظ سے کہنے ہی واجب الاحترام کیوں نہ ہوں لیکن پھر بھی وہ غیر معصوم ہیں ان کی کسی بھی صریح غلطی کی تاویل نہیں ہو سکتی (اسدی)

معلوم ہو گیا ہے جس کی بدولت وہ —

۵ درعین قدم حدوث و فنا را قائل اند و با وجود حدوث بقدم مائل
یعنی قدم و حدوث کا معاملہ اور وجود کی ان دو حیثیتوں کا باہمی رابطہ منطقی سے نہیں
بلکہ کشف و وجدان سے مل ہوتا ہے۔ دوام وجود بھی درست ہے اور قیامت و حشر
بھی یقینی ہے —

۵ ہمہ اوست یا وحدت وجود کا مسئلہ تصوف کا اصول موضوعہ بن گیا ہے، لیکن اس
کی تعبیر اس قدر نازک ہے کہ ذرا سا بھی انحراف ہو تو اس کے ڈانڈے الحاد سے مل جاتے
ہیں۔ مغرب کا ایک مشہور مفکر شوپن ہار کہتا ہے کہ وحدت وجود کا نظریہ الحاد کی شاعری اور
اس کی جدید تصنیف ہے۔ اور امریکہ کا فلسفی ولیم جمیز کہتا ہے کہ وحدت وجود اخلاقی تعطیل ہے
یعنی ذات واحد کے لازمی مظاہر ہونے کی وجہ سے خیر و شر کا باہمی امتیاز محض رہ جاتا ہے اور
باوجود اس تنبیہ کے کہ گم فرق مراتب نہ کنی زندیقی، — تمام مراتب ایک ہی وجود مطلق
میں ضم ہو جاتے ہیں، مثلاً سحابی کی یہ رباعی لیجئے : —

۵ عالم بخروش لا الہ الا ہوست : غافل بگمال کہ دشمن اوست او یادوست
دریا بوجہ خویش موبے دارد : خس پندارد کہ این کشاکش با اوست

تمام عالم میں ایک وحدت مطلقہ کا دریا موجزن ہے۔ اس میں کسی کی دشمنی یا دوستی کا سوال
نہیں، کسی چیز کو خیر اور کسی کو شر سمجھنا اور ایک کا دوسرے سے برسر پیکار ہونا محض
دھوکا ہے۔ نفس کی اندرونی پیکار یا نفس کی طبعی عالم اور ماحول سے کشاکش غیر مہلی ہے۔
۵ گفتہ از وحدت کثرت سخنے گوئی بزم : گفت موج و کف گرداب ہمانا دریا
۵ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں : حیراں ہوں پھر مشاہدے کس حنا میں

۵ — بلکہ اس نظریے میں اسلام اور کفر کا باہمی امتیاز محض اعتباری بن جاتا ہے —

اکبر کا دین الہی اس نظریے کی غلط تعبیر تھی — (استدلال)

ہے مثل نمودِ صُور پر وجودِ بحر : یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و جہاں میں
وحدتِ مطلقہ کا ایک لامتناہی رشتہ ہے جس میں گرہیں پڑ جانے سے کثرت کا دھوکا
ہوتا ہے جس گرہ کو بھی کھول کے دیکھو اس میں رشتے کے سوا اور کچھ نہ ملے گا عالمِ یا اشیاء
کا خدا سے الگ معلوم ہونا اسی قسم کا فریبِ ادراک ہے۔

چونکہ وحدتِ وجود کا نظریہ اپنے نتائج میں قرآنی توحید سے جا بجا ٹکراتا ہوا
معلوم ہوتا ہے، اس لئے مسلمان صوفیہ اور علما کا ایک گروہ توحیدِ وجودی کی بجائے
توحیدِ شہودی کا قائل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عالمِ خدا کے صفات کا مظہر ہے۔ مصدر
کی وحدت کا پر تو مظہر پر بھی ہے۔ وجودِ موجودات کا بھی ہے اور خدا کا بھی، لیکن جن
معنوں میں خدا موجود ہے ان معنوں میں موجودات موجود نہیں۔ خدا اور مخلوقات کی باہمی نسبت
کسی جسم اور اس کے سایہ کی نسبت ہے۔ سائے کا بھی وجود ہے لیکن جسم کے وجود کے
مقابلے میں بے مایہ ہے اور اپنی ذات کے لئے جسم کا محتاج ہے۔ تمام ممکنات و حوادث
ہستی مطلق کے اظلال و پرتو ہیں۔ خدا کی ہستی کے مقابلے میں تمام اشیاء کی ہستی ہیچ اور لعدم
ہے۔ جب انسانی رُوح میں وحدت کا عرفان کا شرفِ حقیقت ہوتا ہے تو پھر یہ کیفیت
ہوتی ہے کہ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے۔ ایما تو لو وجوہکم فتم وجوہ اللہ
شیخ اکبر اور بہت سے اکابر صوفیہ وحدتِ وجود کے قائل ہیں لیکن ان کے ہم مرتبہ دیگر
صوفیہ جن میں مجدد الف ثانیؒ بھی شامل ہیں وحدتِ شہود کو درست سمجھتے ہیں۔
مولانا شبلیؒ مولانا رومؒ کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۱۵۔

”وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں یہ فرق ہے کہ وحدتِ وجود کے لحاظ سے ہر
چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں جس طرح جناب اور موج کو بھی پانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وحدتِ شہود

۱۵ نظریہ وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود کے درمیان صرف لفظی اختلاف ہے۔ معنوی تعبیر کے لحاظ سے ان دونوں

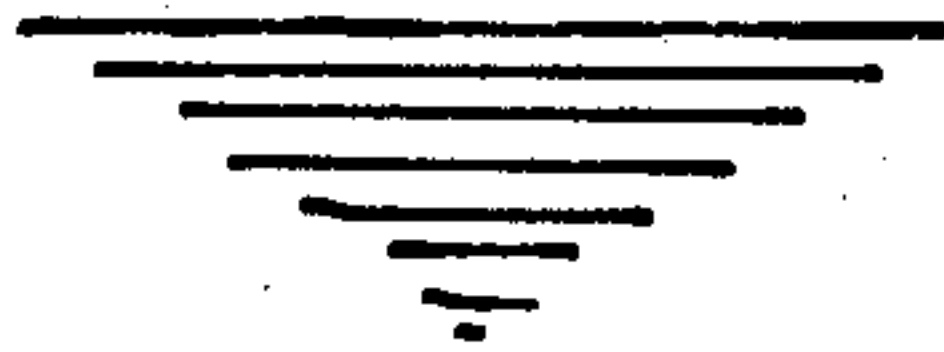
میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ کی کتاب مکتوبِ مدنی میں اس کی پوری تصریح موجود ہے۔ (اسدی)

۱۶ علامہ شبلیؒ کی یہ تصریح غلو سے خالی نہیں ہے، ہندوستان کے اکثر اہل علم اس نظریے سے محفوظ نہیں
رہ سکے۔ (اسدی)

میں یہ اطلاق جائز نہیں کیونکہ انسان کے سائے کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ وحدت وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اہل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر بلا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں، کسی قدر منطقی بحث کے بعد مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح عقیدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ عالم قدیم ہے لیکن وہ ذات باری سے علیحدہ نہیں بلکہ ذات باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے۔ حضرات صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جداگانہ چیزیں ہیں اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ آگے چل کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں البتہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں لیکن یہ شبہ بھی صحیح نہیں قرآن مجید میں بہ کثرت اس قسم کی آیتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن اول و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے۔

ہو الاول هو الآخر هو الظاهر هو الباطن

(حکمت رومی، از خواجہ عبدالحکیم پی ایچ ڈی)



۱۷ علامہ شبلیؒ نے یہ تحریر غلو سے خالی نہیں ہے۔ قرآن کی آیت سے بھی وحدۃ الوجود کے نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ اختراعی تاویلوں سے تو ہر باطل پرست کوئی نہ کوئی دلیل قرآن سے نکال لیتا ہے۔ بہر حال وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود یہ دونوں نظریے صرف الحادی توحید کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس دور میں سب بڑا جہاد یہ ہے کہ ان نظریات کی تردید کر کے اُمت مسلمہ کے ایمان کو بچایا جائے (اسدی)

عالم اسباب

سلسلہ علت و معلول

خواجہ عبدالحکیم پی۔ ایچ۔ ڈی لکھتے ہیں: —

حکماء سائنس، فلاسفہ، اہل دین اور صوفیہ سب کے ہاں سلسلہ علت و معلول کی توجیہات ملتی ہیں لیکن توجیہات میں بے حد اختلافات نظر آتے ہیں کسی نظریہ حیات میں یہ امر نہایت اسامی اور اہم ہوتا ہے کہ دنیا میں جو سلسلہ علت و معلول نظر آتا ہے اس کی ماہیت کیا ہے —

انسان نے جب آزادانہ طور پر ماہیت کائنات پر غور و خوض شروع کیا تو یہ اذعان اس میں موجود تھا کہ مظاہر کی کثرت اور اس کا تنوع ظاہری اور اعتباری ہے حقیقی نہیں، تمام مظاہر اور اعراض کی تہ میں کوئی ایک جوہر ہے اور اشیاء کی کثرت اسی ایک جوہر کی متغیر صورتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ مغربی فلسفہ کی تاریخ کو طالیس ملطی سے شروع کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ کائنات کا اصلی جوہر پانی ہے گویا پانی بحیثیت جوہر علت ہے اور تمام اشیاء و حوادث اس کے معلول ہیں۔ اس کے بعد دوسروں نے کہا کہ نہیں، ہوا اصلی جوہر ہے یا آگ اصلی جوہر ہے۔ اس کے ساتھ ہر ایک کو طبع آزمائی کرنی پڑتی تھی کہ اس کی

توجیہ کرے کہ ایک جوہر بسیط کو علّت مانا جائے تو یہ مختلف اور متضاد نما کثرت کہاں سے آئی۔ کچھ اس قسم کا سوال ان مفکرین کے دلوں میں بھی ابھرتا تھا جسے غالب نے جوہر و وحدۃ الوجود کا قائل تھا ان اشعار میں بیان کیا ہے —

۵ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود : پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں : ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
مغربی فلسفہ ترقی کرتے ہوئے سقراط، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات تک پہنچا۔ ان سے قبل فیثاغوریوں نے جوہر یا ضیات کے ماہر تھے اس عقیدے کی تعلیم دی تھی کہ تمام کائنات کی اصل ریاضیات کے اصول ہیں۔ ریاضیات کے اصول مادی علتیں نہیں لیکن وہ مادی صورتوں میں متشکل ہوتے ہیں۔ ہر شے کسی مخصوص ریاضیاتی تناسب سے ظہور میں آتی ہیں — افلاطون اور ارسطو نے اس سے آگے قدم بڑھایا کہ وجود کی حقیقت خدا ہے جو عقل خالص ہے، یہ عقل جو تصورات کا ایک منطقی نظام ہے زمانی اور مکانی یا جسمانی چیز نہیں ہے۔ یہ عقل حقیقی ہستی ہے اور اس کے علاوہ عدم ہی عدم ہے، لیکن اس عدم میں یہ انفعالی استعداد موجود ہے کہ وہ عقلی تصورات کو قبول کر کے وجود کی شکل اختیار کر لے، جب تک عدم عقلی تصورات یا اعیان ثابتہ سے متاثر نہیں ہوتا، تب تک وہ کوئی وجود اختیار نہیں کر سکتا۔

ارسطو کہتا ہے کہ موجودات کا تدریجی نظام اسی اصول کی بدولت قائم ہے۔ ایک طرف مادہ محض ہے جو عدم محض کے مترادف ہے اور دوسری طرف عقل خالص ہے جو خدا ہے تمام موجودات اس اثبات کلی اور عدم محض کے مابین واقع ہوئے ہیں۔ ارسطو نے کہا کہ علتیں چار اقسام کی ہوتی ہیں، علت فاعلی، علت مادی، علت صوری اور علت غائی۔ مثلاً ایک کوزہ گر کوزہ بناتا ہے، اس کے ہاتھوں کی حرکت اس کوزے کی علت فاعلی ہے، لیکن یہ فعلیت بروئے کار نہ آ سکتی۔ اگر مٹی موجود نہ ہوتی لہذا مٹی بھی کوزے کی

علت ہے اور یہ علت مادی ہے لیکن بنانے والا اس مٹی کو خاص صورت میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ صورت اس کا سبب ہے کہ یہ مٹی کوزہ بنی اور کوئی چیز نہ بنی۔ یہ علت صوری ہے لیکن کوزہ گر کے ذہن میں کوزہ بنانے کی کوئی غرض تھی اس غایت نے بھی علت کا کام دیا، یہی غرض کوزے کی علت غائی ہے۔

فلاسفہ کا عام عقیدہ جسے مسلمان حکماء بھی صحیح سمجھ کر پیش کرتے تھے یہ تھا کہ عالم محسوس و معقولات میں علت و معلول کا ایک اٹل اور لامتناہی سلسلہ ہے جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اٹل قوانین کے مطابق لزوم کے ساتھ واقع ہوتا ہے لیکن مذہب کی ادنیٰ سطح پر عقائد دینی کا مدار زیادہ تر معجزات پر ہوتا ہے، معجزہ کے عام معنی خرق عادت لئے جلتے ہیں یعنی عادتاً علتیں جو معقولات پیدا کرتی ہیں وہ کسی خاص موقع پر کسی نبی کے تصرف یا خدا کی مرضی سے متوقع نتیجہ پیدا نہیں کرتیں، مثلاً آگ کا کام جلانا ہے، لازم ہے کہ انسان کے جسم کو اگر آگ میں جھونک دیں تو وہ ایندھن کی طرح جل جائے گا۔ لیکن از روئے قرآن اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرودنے آگ میں ڈال دیا مگر آگ نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ آگ اُن کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا مقام بن گئی۔ عادتاً جو کچھ ہونا چاہیے تھا۔ نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس قسم کے معجزات کا قائل نہ ہو۔ مذہب اور سائنس میں جو تخالف پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر اسی بنا پر ہے انبیاء کے حالات میں ایسی باتیں بیان کی گئیں ہیں جنہیں خرق عادت یا معجزہ کہہ سکتے ہیں۔ بعض معقولات پسند لوگوں نے ان واقعات کی ایسی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے جن سے یہ معجزات عام قوانین فطرت کے مطابق ثابت ہو سکیں۔

لیکن ان تاویلوں میں خواہ مخواہ کی کھینچا تانی معلوم ہوتی ہے۔

صحیح اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ خدا خالق و ناظم کائنات ہے محدود عقل کے حکمران جب کوئی قاعدہ بناتے ہیں تو کبھی تغیر حالات اور کبھی محض متلون خواہشات سے قاعدے

بدل دیتے ہیں لیکن جو خالق علیم و حکیم اور عالم کُل ہے وہ ایسے قواعد نہیں بناتا جنہیں بار بار بدلنے کی ضرورت پڑے، موجودات و مظاہر کے عالم کے دُورِخ ہیں۔ ثباتِ آئین بھی ہے اور تغیرِ حوادث بھی۔ ہوائیں چلتی رہتی ہیں لیکن ہواؤں کے چلنے کا قانون اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ سیارے گردش کرتے رہتے ہیں لیکن حرکت کے قوانین گردش نہیں کرتے۔

علماءِ طبیعیین کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے محدود تجربے کے مادی عالم اور اس میں عمل کرنے والے قوانین کو کُلّی سمجھ لیا کہ جو کچھ ہے یہی ہے اور عاداتِ علّت و معلول کا بولزوم ہمارے تجربے میں آتا ہے اس کے علاوہ کائنات میں کوئی نہ کوئی اور قوتیں کار فرما ہیں اور نہ کوئی اور اسباب ہیں، انہوں نے دُنیا کو عالمِ اسباب سمجھا۔ لیکن ان کا عالمِ تصور اور اسباب کا تصور نہایت محدود تھا، انہوں نے کُل کو اسی جُز و پُر قیاس کیا جو ان کے محسوسات و معقولات کے محدود دائرے میں سما سکا۔ خدا کی مشیت کہیں بے حکمت نہیں اور حکمت کہیں متلون اور بے اصول نہیں۔ خدا کا کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علّت ہوتی ہے۔ اسلام اس عقیدے کی تلقین کرتا ہے کہ حیات و کائنات کا سلسلہ اتنا وسیع ہے اور اس میں عمل کرنے والے اسباب و قوانین کی اتنی تعداد ہے کہ کلیتہً کسی کے احاطہِ ادراک میں نہیں آ سکتی۔

اگر دُنیا کے تمام سمندر سیاہی اور روشنائی بن جائیں اور اس سیاہی سے کلماتِ اللہ، کو لکھنا شروع کر دیں تو یہ تمام سمندر اور ان جیسے اور بھی ختم ہو جائیں لیکن کلماتِ الہی ختم نہ ہوں۔ — کچھ طبقات وجودِ انسانی کے سامنے اس کے اندر اور اس کے باہر موجود ہیں اور ہر طبقے میں علّت و معلول کا ایک الگ قسم کا سلسلہ ہے جمادات کو ان کی جمادی کیفیت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ انہیں قوانین پر عمل کریں گے جو ان کی فطرت کی طرف سے معین ہو چکے ہیں لیکن جمادات سے اُوپر نباتات کا درجہ ہے اُو

نباتات کے قوانین جمادات سے الگ اور ان سے بالاتر ہیں جب نشوونما پذیر بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے تو زمین کے جمادی عناصر پر نباتی قوانین کا عمل جاری ہوتا ہے۔ جماد کے عالم اسباب پر نبات کا سلسلہ علت و معلول دخل انداز ہو کر نتیجے کی صورت بدل دیتا ہے۔ گویا ہر پودے کی آفرینش ایک خرق عادت ہے، اسی طرح قرآن کریم معجزہ طلب کر نیوالوں کو بار بار کہتا ہے کہ دیکھو جمادی زمین میں سے نباتی زندگی کس طرح پیدا ہوتی ہے، انگریزی کا مشہور مصنف بیورے نکلز اپنے سوانح میں لکھتا ہے کہ میں نے دین کی تلاش میں تمام ادیان اور فلسفوں کا مطالعہ کر ڈالا لیکن کسی بیان اور کسی استدلال نے مجھ کو خدا کی ہستی کا یقین نہ دلایا۔ آخر میں نے کتابوں سے روگردانی کر کے باغبانی شروع کی۔ جب زمین سے رنگارنگ کے پھول نکلے تو میں خدا کا قائل ہو گیا۔ حیات آفرینی اور جمال آفرینی کا یہ حیرت انگیز معجزہ تمام دلائل سے زیادہ قوی ثابت ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی باغبان منکر خدا نہیں ہو سکتا۔

نباتات میں جو قوانین عمل کرتے ہیں ان سے کچھ الگ قوانین اور الگ علتیں حیوانات کی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات نباتات کو کھا جاتے ہیں مہضم ہونے اور جزو بدن بننے کے بعد نباتات کی ماہیت بدل جاتی ہے اور حیوانیت کی قوت نباتات میں سے وہ معلومات پیدا کرتی ہے جو نباتات میں بحیثیت نبات پیدا نہ ہو سکتے یہاں بھی خرق عادت ہی کا معجزہ ہے۔ ایک طبقہ حیات کی عادت کو بالاتر طبقہ حیات کی علتوں نے کارفرما ہو کر بدل دیا۔ محض حیوانیت سے اوپر ذہن و نفس کا عالم ہے۔ نفسی قوانین باقی اور جسمانی قوانین سے الگ ہوتے ہیں۔ مادہ اور جسم کا عمل نفس پر ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس نفس بھی مادہ و جسم پر مؤثر ہوتا ہے جسم کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیں تو وہ اپنے قوانین معینہ کے مطابق عمل کریگا۔ لیکن نفس کی حالت کے تغیرات اس کی خواہشات، اس کے جذبات، اس کے ارادے جسمانی حالتوں میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ خوشی اور

غم اور خوف اور حزن سب نفسی کیفیتیں ہیں لیکن یہ کیفیتیں جسم میں فوری تغیر پیدا کرتی ہیں۔
اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی غیر متبدل سنت یہ ہے کہ ہستی کا ہر طبقہ ان مخصوص قوانین پر عمل
کرے جو اس کے لئے مقرر ہیں لیکن اعلیٰ تر طبقے کا عمل ایک بالاتر قانون کے ماتحت
اُدُنے طبقے کے معلولات میں تبدیلی پیدا کرے تاکہ ادنیٰ اعلیٰ کے زیر اثر ہو کر خود اوپر

کی طرف اُٹھے اور اپنی ہیئت اور ماہیت میں ارتقائی انقلاب پیدا کرے۔
اشاعرہ نے جب یہ دیکھا کہ حکماء طبعیین کے زیر اثر لوگ مادی علل کو ایک مستقل
اور ناقابل تغیر سلسلہ سمجھ کر دینی عقائد سے منحرف ہو رہے ہیں تو انہوں نے سرے سے سلسلہ
اسباب ہی کا انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اشیاء میں فی نفسہ کوئی خواص نہیں کسی علت میں کوئی
تاثیر نہیں کوئی سبب مؤثر نہیں۔ ہر قسم کے خوارقِ عادت اور کرامتیں ہر وقت ہر حالت
میں سرزد ہو سکتی ہیں۔ حکماء اور اشاعرہ دونوں افراط و تفریط کے مرکب ہوئے اور جادہ
حقیقت سے ہٹ گئے، حکماء کی تنگ نظری سے خود حکمت کو نقصان پہنچا اور

مدعیانِ دین نے دین کی حمایت اس متعصبانہ اور جاہلانہ انداز سے کی کہ خود دین معقول
انسانوں کی نظر میں قابل قبول نہ رہا، سچے دین کا یہ تقاضا نہیں ہو سکتا، کہ خدا کے مقرر کردہ
سلسلہ اسباب کا انکار کیا جائے۔ دین کا تقاضہ فقط یہ ہے کہ خدا کو سبب الاسباب
مانا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ کائنات میں اسباب کے جو سلسلے ہیں وہ خود بخود وجود میں
نہیں آئے یہ نظم کسی ناظم نے پیدا کیا ہے اور وہ ناظم اس نظم کو پیدا کرنے کے بعد
خود معطل نہیں ہو گیا۔ اسباب و وسائط میں جو اثر ہے۔ اور چیزوں کے اندر جو خیر و شر

ہے وہ خدا کی حکمت و مشیت کا آفریدہ ہے۔

طبعی سائنس کی ترقی اس یقین کی بدولت ہوئی کہ مادی عالم میں علت و معلول کا
ایک سلسلہ ہے یعنی یکساں علتیں، یکساں معلولات پیدا کرتی ہیں۔ معلولات سے علل کی
طرف اور علل سے معلولات کی طرف استدلال ہو سکتا ہے۔ یعنی مادی عالم میں جو سنت اللہ

تھی وہ سائنس دانوں پر منکشف ہوتی گئی اور اس علم سے جو مظاہر کے روابط کا علم تھا انسان کو قوتِ تسخیر حاصل ہو گئی۔ عناصر کے خواص کا جو علم بڑھتا گیا انسان ان کی ترکیب و تحلیل سے جلد منفعت اور دفعِ مضرت کے سامان مہیا کرتا گیا۔ اس کامیابی نے مادی زندگی میں انسان کی بے بسی کو بہت کچھ کم کر دیا۔ یہاں تک تو بات درست بھی تھی اور مفید بھی، لیکن مادی فطرت کی اس تسخیر نے طبیعی علماء کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا کہ تمام موجودات کا جوہر اصلی یہی مادہ ہے۔ مادی مظاہر کی تسخیر ریاضیات کے اطلاق سے ہوتی تھی اس لئے یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ حوادث کی تمام کیفیتیں کمیتوں میں تحلیل ہو سکتی ہیں جو چیز حقیقی ہے وہ ناپی اور تولی جا سکتی ہے۔ جو چیز ناپی یا تولی نہ جا سکے وہ نہ کوئی حقیقی علت ہے اور نہ کوئی حقیقی معلول جسم اور دماغ مادی ہیں لہذا وہ حقیقی ہیں لیکن نفس کا وجود محض خیالی ہے۔

انسان یہ بھول گیا کہ خود مادے کا علم بھی آخر نفس کی وساطت سے حاصل ہوا اگر نفس محض سمیائی ہے تو مادے کے متعلق اس کے محسوسات اور معقولات بھی بے حقیقت ہونے چاہئیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ نفس کی علمی پیداوار کو حقیقی سمجھ لیا لیکن خود نفس کے وجود سے انکار کر دیا۔ نفس کا اگر کوئی وجود ہی نہیں تو وہ کوئی متوثر عامل کیسے ہو سکتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکالا کہ علتیں تمام مادی ہیں۔ جمادات کے قوانین زیادہ وضاحت سے سمجھیں آگئے تھے اس لئے کہ یہ قوانین مقابلتاً سادہ ہوتے ہیں اور ان کا لزوم ریاضیات کا سا لزوم ہوتا ہے جس طرح ہندسوں اور ہندسی اشکال کے خواص معین اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اسی طرح برق و باد کے اعمال بھی اُپل قوانین کے زیرِ نگین ہوتے ہیں۔

جمادات کے اُپر نباتات کا درجہ تھا جہاں علتیں خالص مادی نہیں رہیں وہاں زندگی کی ابتداء تنظیمِ جمالِ آفرینی اور مقصد کوئی شروع کر دیتی ہے۔ سنگ و خشت میں کہیں یہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ اب طبیعیین نے اس سعیِ لامصل میں مغز کھپانا شروع کیا

کہ نشوونما کے اعمال کی توجیہ مادے کے میکائی اعمال سے کی جائے، نباتات کی ابتدائی سی زندگی کو بھی وہ مقصد کوشش علت و معلول کے سلسلے سے خارج کرنا چاہتے تھے اور اس کا اقرار کرنا علم طبیعت کی توہین سمجھتے تھے کہ خالی مادہ اور مادی حرکت کے علاوہ حیات کی مقصود طلبی بھی کائنات میں موجود ہے۔ یہاں اسباب کا سلسلہ اور انداز کا ہو جاتا ہے اور حیات اپنی ادنیٰ منزل میں بھی مادہ محض پر اثر کر کے اس کے نتائج کو بدلتی اور اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے غلطی اس میں نہ تھی کہ انسان سلسلہ اسباب کا قائل ہو جائے اور اس عقیدے پر عمل کر کے تسخیر فطرت کرے بلکہ اصل کوتاہی اس میں تھی کہ انسان نے زندگی کے ادنیٰ ترین مظہر یعنی عالم مادی کو حقیقت کلی تصور کر کے جس قسم کا سلسلہ علت و معلول اس میں نظر آیا اس کو تمام موجودات پر حاوی سمجھ لیا انسان کی اصل حقیقت نفسی ہے۔ انسان کا نفس جسم کو بطور آلہ استعمال کرتا ہے اور عالم مادی کے بھی اپنے مخصوص مقاصد کا حصول چاہتا ہے —

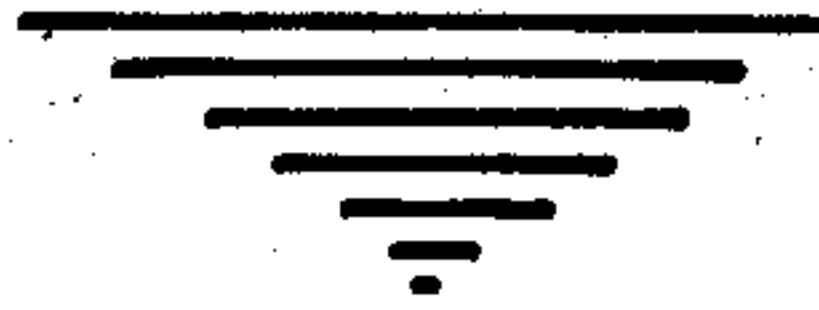
مادیت، حقیقت حیات اور حقیقت نفس کی منکر ہو گئی اور خیر و شر کی نسبت فقط یہ نظریہ رہ گیا کہ جسمانی زندگی کو فائدہ پہنچانے والی یا جسمانی لذت پیدا کرنے والی چیز انسان کو خیر محسوس ہوتی ہے اور جس چیز سے جسمانی دکھ پہنچے اس کو انسان شر سمجھتا ہے۔ تمام اخلاقیات محض جسمانی لذتیت بن گئی —

انگلستان میں لذتیت کے امام بنتھم نے کہا کہ لذتوں میں مقدار یا کمیت کا فرق ہوتا ہے کیفیت کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ذوق علم، ذوق جمال، عدل و رحم کی لذت، کار خیر کی لذت اور علوا کھانے کی لذت سب مساوی ہیں۔ اس مادی فلسفے کے مطابق کائنات میں کوئی اخلاقی نظام نہیں —

ہکسلے نے کہا کہ کائنات میں کہیں اخلاق کا وجود نظر نہیں آتا۔ کائنات کے خالص مادی شعبے کو رانہ میکائی جبر کی وجہ سے اخلاق سے بے نیاز ہیں اور نباتات و حیوانات کے

تنازع البقا میں حد درجے کا ظلم نظر آتا ہے۔ اخلاقی اقدار اتفاقی طور پر انسان کے اندر سے اُبھر پڑے ہیں۔ چیز اچھی ہے اس کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اعتقاد یہ رکھنا چاہیے کہ کائنات اور اس میں کارفرما قوتیں نہ اس کی ماخذ ہیں اور نہ اس کی حامی۔ مادیوں کی منطق میں صریحی داخلی تناقص پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب اس کا اطلاق زندگی پر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر علیتیں فقط مادی ہوں اور نفس بھی مادی ہو تو بھلائی کو ترجیح دینے اور بُرائی سے بچنے کا اختیار کہاں سے آئے گا۔ مادی فلسفہ کے لحاظ سے اختیار بے معنی چیز ہے اور نفس کا ایک دھوکہ ہے۔

(حکمتِ رومیؒ)



کیا یہ مسلمان ہیں؟

کمرے بُت کی ہونٹوں پر جاتا تو کافر | جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر،
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر، | ستاروں میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کُشادہ ہیں! ہیں!

پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں،

نبیؐ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں | اماموں کا رتبہ نبیؐ سے بڑھائیں
یہ عُسوں پہ دن ات ندریں چڑھائیں | مزاروں پہ جابجا کے نگیں دُھائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے

نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے!

(از: مسدس حالی)

مجلس نشر السنۃ، مخدوم رشید (ملتان)

(بہارِ حقیقہ)

تصانیف علامہ محمد ابوالخیر شاہ اسدی علیہ الرحمۃ

أصول القرآن

پہلا پارہ ترجمہ وحاشیہ

أم الكتاب میں اللہ کا تعارف

فلسفہ الٰہیات کے عجیبی تصورات

عصری دہریت کے دلائل کا جواب

تقدیر کا عقیدہ

قرآن میں نزول مسیح کا حتمی فیصلہ

اسلام میں نزول مسیح کا تصور

نزول کے بعد حضرت عیسیٰ کا مقام رسالت

نزول مسیح کا معکوس عقیدہ

پرویزی مسلک میں خدا کا تصور

میراث میں عدل

تفہیم الالہ (عربی شاعری)

جواہر المنشورہ

اللہ کے نور سے نور کا ظہور

مقام نبوت کی عجیبی تعبیر

فلسفہ توحید کی عجیبی تشکیل

وحدۃ الوجود کے بنیادی نقائص

باطنی رفق اور وحدۃ الوجود

مقام نبوت اور ابن عربی

ابن عربی کے نظریات کا ضرر

بروزی نبوت

تکوینی نبوت کا عصر حاضر میں مفہوم

سحر نبوی

سیرۃ الحسنی

حکمت کی باتیں

بالغ مسلمان پر کلمہ کی فرضیت

مسلمانوں کا رسمی اسلام

سوشلسٹ علماء کا کردار

کیمیو نزم اور مذہب